بقا پرنٹرز اینڈ پبلشرز
کراچی

محمد مظہر بقا
فاضلِ دیوبند، ایم۔اے، پی ایچ۔ڈی

بقا پرنٹرز اینڈ پبلشرز
کراچی

ضابطہ

ناشر	:	بقا پرنٹرز اینڈ پبلشرز
طباعت	:	خالد پرنٹرز، اردو بازار، کراچی ـ ۷۴۲۰۰
کتابت	:	بقا کمپوزنگ سروسز، اردو بازار، کراچی ـ ۷۴۲۰۰
اشاعت	:	نومبر ۱۹۹۶ء
قیمت		۱۰۰ روپے

ملنے کا پتہ

بقا پرنٹرز اینڈ پبلشرز

اے ـ ۷، پہلی منزل، ہاشمی ٹرسٹ بلڈنگ

اُردو بازار، کراچی ـ ۷۴۲۰۰

فون: ۲۶۳۳۶۷۵

فہرستِ مضامین

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دنیا میں ایک ہوشمند انسان بھی ایسا نہیں ہو سکتا جس کے سینے میں کچھ قابل ذکر یادیں محفوظ نہ ہوں۔ لیکن عام طور پر یہ یادیں اس کے ساتھ ہی دفن ہو جاتی ہیں اور زمانے کا استبداد ان کی زبانی روایات کو بھی طاق نسیاں کی نذر کر دیتا ہے۔

میرے سینے میں بھی کچھ یادیں محفوظ ہیں۔ میں نے سوچا کہ انہیں سینے سے سفینے میں منتقل کر دوں۔

اس کتاب میں علماء، صوفیا، شعراء اور مجذوبوں کے تذکرے بھی ہیں، حق گوئی، بلند اخلاقی، رواداری اور مہوسی کے واقعات بھی، کچھ حیرت افزا اور عبرت انگیز قصے بھی، بعض مجرب نسخے اور عملیات بھی اور دوسری مفید اور دلچسپ باتیں بھی۔

امید ہے کہ یہ کتاب دلچسپی کا باعث ہوگی اور نفع بخش بھی۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کچھ بعید نہیں کہ اس کتاب کو میری نیت "علم ینتفع بہ" میں سے شمار فرمالے۔

١٢/٣/١٤١٧ھ

٢٧/٧/١٩٩٦ء

کچھ ناشر کے بارے میں...

یہ کتاب "بقا پرنٹرز اینڈ پبلشرز" سے شائع ہو رہی ہے۔ یہ ادارہ میرے سب سے چھوٹے بیٹے محمد اعظم بقا کی ملکیت ہے۔ اعظم کے بارے میں، میں نے اپنے کچھ تاثرات اپنی کتاب "حیاتِ بقا" میں قلمبند کئے ہیں۔ اب چند سال بعد اندازہ ہوا کہ عمر میں اضافے کے ساتھ ساتھ اس کے شعور میں خاصی پختگی آچکی ہے۔ حالات کا تجزیہ کرنے اور صحیح نتیجے پر پہنچنے میں اس کی صلاحیت قابلِ رشک ہے۔

"حیاتِ بقا" کی اشاعت میں بھی اعظم نے کافی محنت کی تھی، خاص طور پر سرورق کی تزئین اور کتاب کی تبویب اسی کی فکر کا نتیجہ تھی۔

موجودہ کتاب "کچھ یادیں" میں اس نے "حیاتِ بقا" سے بھی زیادہ محنت کی ہے۔ بعض جگہ ایک لفظ کے بجائے زیادہ موزوں لفظ کے انتخاب اور کہیں کہیں عبارت کا ابہام دور کرنے میں بھی اس نے بہت مفید مشورے دیئے ہیں، خاص طور پر کتاب کی تصحیح میں بڑی دقتِ نظر سے کام لیا ہے۔

اگر اپنے ادارے سے شائع کردہ ہر کتاب کے سلسلے میں وہ اسی محنت اور وقتِ نظر کا اہتمام کرتا رہے تو امید ہے کہ انشاء اللہ اس کا شمار ممتاز ناشرین میں سے ہوگا۔

اللہ تعالیٰ اسے دارین کی سعادتیں نصیب فرمائے، آمین۔

حضرت شیخ الہند
مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ

مجھ سے میرے استاد مولانا منتخب الحق صاحب نے بیان کیا کہ ایک مرتبہ مولانا معین الدین صاحب اجمیری (مولانا کے استاد) دلی آئے تو حضرت شیخ الہند کی زیارت کے لئے دیو بند بھی پہنچے ۔ گھر پہنچ کر زنجیر کھٹکھٹائی تو ایک صاحب باہر آئے ۔ان سے مولانا معین الدین مرحوم نے کہا کہ حضرت شیخ الہند سے کہہ دو کہ اجمیر سے معین الدین آیا ہے ۔ان صاحب نے مولانا معین الدین کو اندر بلا کر ڈیوڑھی میں پڑے ہوئے پلنگ پر بٹھایا، پھر اندر سے گڑ اور پانی لائے اور ان کے پاس بیٹھ کر ان کی تواضع کرنے لگے ۔ تھوڑی دیر ہوئی تو مولانا معین الدین نے کہا: میاں ہم نے تم سے کہا کہ حضرت شیخ الہند کو ہماری آمد کی اطلاع کر دو، اور تم اب تک ہمارے پاس بیٹھے ہو ۔ان صاحب نے جواب دیا: اگر شیخ الہند سے آپ کی مراد محمود حسن ہے تو یہ نام تو اسی خاکسار کا ہے۔

حضرت شیخ الاسلام
مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمتہ اللہ علیہ

در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق
ہر ہوسنا کے نداند جام و سنداں باختن

اپنے اساتذہ کی فہرست میں اگر میں نے کسی شخصیت کو مذکورہ شعر کا حقیقی مصداق پایا تو وہ صرف شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمتہ اللہ علیہ کی شخصیت تھی۔

حضرت رحمتہ اللہ علیہ تقریریں بکثرت کرتے تھے۔ان کا کوئی ہفتہ بھی سیاسی تقریروں سے خالی نہ جاتا تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہیں تقریر کا فن نہ آتا تھا۔سیدھے سادے الفاظ میں اپنے مافی الضمیر کو ظاہر کرتے تھے۔

لیکن خلوص پر مبنی ان کی تقریریں "ہرچہ از دل خیزد بردل ریزد" کا مصداق ہوتی تھیں۔ان کی تقریروں میں ان کے غیر معمولی حافظے کا بڑا دخل تھا۔انگریز مصنفین کی کتابوں کے حوالے بقید صفحات دیتے جاتے تھے۔

یوں تو سب ہی اساتذہ اور طلبہ ان کا احترام کرتے تھے لیکن چند اساتذہ اور ان کے زیرِ اثر طلبہ کو چھوڑ کر، جو سیاسی طور پر مسلم لیگی تھے، باقی تمام اساتذہ و طلبہ ان سے فداکارانہ محبت کرتے تھے۔میں نے بارہا اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور یہی صورتِ حال خود پر بھی گذری ہے کہ حضرت مدنی درس کے لئے آتے ہوئے دار جدید کے دروازے میں داخل ہوئے اور جن طلبہ کی ان پر سب سے پہلے نظر پڑی ان کے منہ سے نکلا: "مولانا" اور یہ لفظ ایک منہ سے دوسرے منہ تک منتقل ہوتے ہوئے دار جدید کے

پورے وسیع وعریض احاطہ میں گونج گیا۔ اب یہ کیفیت ہے کہ مولانا چند طلبہ کے جلو میں، دار جدید کے دروازے سے دارالحدیث تک کا طویل فاصلہ طے کر رہے ہیں اور جو طالب علم جہاں کھڑا ہے وہیں کھڑا رہ گیا ہے اور نظریں مولانا پر گڑی ہوئی ہیں تاآنکہ مولانا دارالحدیث کی سیڑھیاں چڑھ کر نظروں سے اوجھل نہ ہو جائیں۔

اس نالائق نے بخاری اور ترمذی حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ ہی سے پڑھیں اور دارالعلوم کی سند کے علاوہ حضرت سے خصوصی سند بھی حاصل کی۔ فراغت کے بعد حضرت کے ہاتھ پر بیعت بھی کی۔ حضرت نے پاس انفاس کا عمل بتایا، لیکن شومیٔ قسمت کہ میں اس پر پابندی نہ کر سکا۔

حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ

شیخ الادب و الفقہ حضرت مولانا اعزاز علی صاحب دیو بند کے اکابر اساتذہ میں تھے ۔ انہیں مشکل ہی سے کسی نے مسکراتے دیکھا ہو گا ۔ ان کی سلام میں سبقت ضرب المثل تھی ۔ شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا تھا کہ کوئی شخص سلام میں ان سے سبقت کر سکے ۔ وقت کے انتہائی پابند تھے ۔ گھنٹہ پر موگری پڑتے ہی سبق شروع کرا دیتے اور گھنٹہ ختم ہوتے ہی ختم کر دیتے، خواہ بات ادھوری ہی کیوں نہ ہو ۔ عربی عبارت کا ترجمہ اس طرح کرتے تھے کہ پوری ترکیب نحوی سمجھ میں آتی جاتی تھی، اس میں ایک لفظ بھی بھرتی کا نہ ہوتا تھا ۔ اسی لئے بعض طلبہ کی کوشش یہ ہوتی تھی، خاص طور پر ادب کی کتابوں میں کہ ترجمے کے جو الفاظ ان کے منہ سے نکلیں انہیں بعینہٖ قلمبند کر لیں ۔ طلبہ پر بے انتہا شفیق تھے، لیکن کسی طالب علم سے ان کی خوشی یا ناخوشی کا مدار اس پر ہوتا تھا کہ کون کس حد تک محنتی یا بدشوق ہے ۔ بعض طلبہ یہ کرتے تھے کہ ان کے درسگاہ جانے اور آنے کے اوقات میں ان کی گذرگاہ پر کتاب کھول کر کھڑے ہو جاتے تھے اور کتاب میں اس درجہ مصنوعی انہماک بیدار کرتے کہ گویا انہیں حضرت کے گذرنے کا احساس بھی نہ ہوا ۔

میں نے حضرت شیخ الادب سے حسبِ ذیل کتابیں پڑھی ہیں :

ہدایہ اخیرین، دیوان متنبی، دیوان حماسہ، شمائل ترمذی اور خارج میں عروض المفتاح ۔

حضرت کے بعض حالات میں نے اپنی کتاب " حیاتِ بقا " میں وہاں درج کئے ہیں جہاں دیو بند میں اپنے طلب علم کے دور کا ذکر ہے اور وہیں پر راقم کے نام حضرت کے دو خطوط کے فوٹو بھی دیئے ہیں ۔

حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ

دارالعلوم دیوبند کے مہتمم قاری طیب صاحب مرحوم نہایت خوبصورت انسان تھے ۔ سردیوں کے زمانے میں جب ہری شال اوڑھ کر نکلتے تو چہرے کی یہ کیفیت ہوتی جیسے ہری پتیوں کے درمیان گلاب کا پھول کھلا ہو ۔ میں نے ان سے خارج میں حجۃ اللہ البالغہ کے کچھ اسباق پڑھے ہیں ۔

ایک مرتبہ حج کے لئے تشریف لائے ۔ان کے صاحبزادے مولوی سالم صاحب بھی ہمراہ تھے ۔دیوبند کے منتسبین کو جمع کیا گیا، میں بھی حاضر ہوا ۔فارغ التحصیل طلبہ کی ایک مجلس کا قیام عمل میں لایا گیا اور سرپرست کی حیثیت سے مولوی سالم صاحب نے قاری طیّب صاحب کا نام پیش کیا ۔فرمایا: یہ سرپرستی اگر صرف دعا گوئی کی حد تک ہے تو مجھے منظور ہے اور اگر کام بھی مطلوب ہو تو میری عمر اس کی متحمل نہیں ۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ

ہندوستان ترک کر کے جب کراچی پہنچا تو استادِ گرامی حضرت مولانا منتخب الحق صاحب کے ہمراہ ملازمت کے لئے حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مجھے دارالعلوم دیوبند میں حضرت کی شاگردی کی سعادت نصیب ہو چکی تھی، لیکن مجھ جیسے نالائق شاگرد اس استاد کو کس طرح یاد رہ سکتے ہیں جس کے سامنے ہر درس میں سینکڑوں طلبہ بیٹھتے ہوں۔ مولانا منتخب الحق صاحب نے تعارف کے بعد آمد کا مقصد بیان کیا۔ حضرت نے فرمایا: آپ دو تین روز افتاء کا کام کیجئے تاکہ طرفین کام کی نوعیت کو دیکھ سکیں۔

حضرت کے اس جواب پر مجھے خوشی بھی ہوئی اور تعجب بھی۔ خوشی اس لئے کہ جواب مایوس کن نہ تھا اور تعجب اس لئے کہ جس ہیئت کے ساتھ میں حضرت کی خدمت میں پہنچا تھا وہ اس طرح کے جواب کی مستحق ہرگز نہ تھی۔ اگر حضرت مفتی صاحب کی جگہ میں اور میری جگہ مجھ جیسا کوئی اور ہوتا، جس کو مجھ سے شاگردی کا تعلق بھی رہا ہو، تو اگر مولانا منتخب الحق صاحب کی موجودگی کا لحاظ کرتے ہوئے میں اپنے جذبات پر قابو پا کر مصنوعی خوش اخلاقی کا مظاہرہ بھی کرتا تو بھی معذرت کے سوا میرا اور کوئی جواب نہ ہوتا۔

چہرے پر سکھوں جیسی چڑھی ہوئی ڈاڑھی اور مونچھیں، سردار عبدالرّب نشتر جیسا عمامہ اور اس کے ساتھ پتلون اور قمیص (جو مولوی امتیاز احمد مرحوم سے مستعار لئے تھے، کیونکہ میرے کپڑوں اور سامان کا بکس تو کراچی کے سفر میں گم ہو چکا تھا)۔ اس ہیئت کے ساتھ افتاء کے مقدس کام کی طلب، مسور کی دال کی تمنا نہیں تو اور کیا ہے، اور کیا ایسا شخص معذرت کے سوا کسی اور جواب کا مستحق ہو سکتا ہے؟

لیکن حضرت مفتی صاحب نے، اللہ ان پر ہزاروں رحمتیں نازل فرمائے، ظاہر کو نظر انداز فرما دیا اور دیکھنا یہ چاہا کہ اس شخص میں صلاحیت بھی ہے یا نہیں ۔ بلکہ بعد کے دور میں حضرت کی فراستِ ایمانی کے جو واقعات میرے سامنے آئے ان کی روشنی میں، اپنی تمام تر نالائقی کے باوجود، مجھے تو یہ کہنے میں بھی تامل نہیں کہ حضرت نے پہلی نظر ہی میں یہ اندازہ فرمالیا کہ "آدمی ہے کام کا"۔

چونکہ اس سے قبل ٹونک کے محکمہ شرعیہ میں مفتی کی حیثیت سے کام کر چکا تھا، اس لئے فتویٰ نویسی کی تکنیک سے واقف تھا۔ تیسرے روز ہی حضرت نے فرمایا کہ آپ چاہیں تو کام جاری رکھیں، ہم فی الحال صرف ۱۲۵ روپے ماہوار دے سکیں گے (حالانکہ مجھ سے پہلے جو صاحب یہ کام کرتے تھے انہیں صرف ۶۵ روپے ماہوار ملتے تھے اور اس پر بھی میرے تقرر سے چند روز قبل انہیں جواب دیا جا چکا تھا)۔

بہرحال افتاء کا کام شروع کر دیا اور اس مقدس کام سے پاکستان میں تحریری ملازمت کی ابتداء ہوئی ۔ اور اس وقت جبکہ یہ سطور لکھ رہا ہوں مکہ مکرمہ کی جامعہ ام القریٰ میں اپنی موجودہ ملازمت اور کام کی نوعیت کو دیکھتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ یہ وہی تناور درخت ہے جس کا بیج حضرت مفتی صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے ہاتھوں کراچی میں بویا گیا (کیونکہ جمالی صاحب نے، جیسا کہ میں نے ان کے حالات میں لکھا ہے، میری نوجوانی میں یہ پیشن گوئی کی تھی کہ تم کسی ایسے بڑے شہر میں سکونت اختیار کرو گے جو سمندر کے کنارے ہوگا اور وہیں سے تمہاری قسمت کھلے گی)۔

فتویٰ نویسی میں عام طور پر تو یہی ہوتا تھا کہ حضرت مفتی صاحب "الجواب صحیح" لکھ کر دستخط فرما دیتے تھے لیکن اگر جواب میں خامی ہوتی تو فرماتے فلاں فلاں کتابیں اور دیکھو اور جب وہ کتابیں دیکھتا تو واقعتہً اپنے جواب میں ترمیم کرنی پڑتی۔

کبھی ایسا بھی ہوتا کہ فرماتے: "اس جواب میں مجھے غلطی تو نظر نہیں آتی لیکن دل اسے قبول نہیں کرتا، مزید غور کرو"۔ بیشتر تو یہی ہوتا کہ مزید غور و فکر کے نتیجے

میں مجھے اپنے جواب میں ترمیم کرنی پڑتی، بصورتِ دیگر حضرت فرماتے کہ اچھا اسے اس طرح لکھ دو۔ اور اسی طرح کے مواقع پر احساس ہوتا تھا کہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نرے فقیہ نہ تھے بلکہ فقیہ النفس تھے۔ اللہ تعالیٰ ان پر اپنی ہزاروں رحمتیں نازل فرمائے۔

ناظم الدین وزارت کے زمانے میں جبکہ دولتانہ پنجاب کے وزیر اعظم تھے، قادیانی تحریک برپا ہوئی۔ اس زمانے میں ایک استفتاء آیا کہ قادیانیوں کے خلاف اس تحریک میں شریک ہونے اور اس میں مرجانے کا شرعی حکم کیا ہے۔ میں نے وہ استفتاء حضرت کے سامنے پیش کر دیا۔ فرمایا اس کا جواب نہ دو اور وجہ یہ بتائی کہ بعض مرتبہ اس طرح کے استفتاء کا اصل مقصد واقعۃً شرعی مسئلہ دریافت کرنے کے بجائے یہ ہوتا ہے کہ مفتی کو فتنہ میں مبتلا کیا جائے۔ لیکن اس سے قطع نظر شرعی صورت حال یہ ہے کہ دارالاسلام کی ادنیٰ تعریف یہ ہے کہ وہاں مسلمان اس پوزیشن میں ہوں کہ اگر اسلامی قوانین نافذ کرنا چاہیں تو کوئی دوسری داخلی قوت انہیں اس سے روک نہ سکے۔ اس اعتبار سے پاکستان دارالاسلام ہے اور دارالاسلام کے خلاف اس طرح کی تحریک جائز نہیں۔

دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ قادیانی کافر ہیں اور ان کے خلاف تحریک میں حصہ لینا باعثِ اجر و شہادت ہے۔ اور جب دو اصول ٹکرا رہے ہوں اور ذہن صاف نہ ہو تو ایسی صورت میں فتویٰ نہیں دینا چاہیئے۔

ایک مرتبہ میں نے فتویٰ میں **الفقہ علے المذاھب الأربعہ** کا حوالہ دے دیا۔ حضرت مفتی صاحب نے دیکھا تو فرمایا، میں نے آج تک اس کتاب میں کوئی مسئلہ غلط تو نہیں دیکھا لیکن اس کتاب کا علماء کے درمیان ہنوز تداول نہیں ہوا اور فتویٰ متداول کتاب سے دیا جاتا ہے۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم نے ایک مرتبہ حضرت مفتی صاحب سے

فرمائش کی کہ فقہ پر کوئی ایسی کتاب مرتب فرمادیں جو ائمہ مساجد کے لئے نصاب کا کام دے۔ حضرت مفتی صاحب نے ایک روز فرمایا کہ پورا خاکہ ذہن میں نہیں آرہا۔ کہیں کراچی سے باہر چلیں، جگہ کی تبدیلی سے بھی ذہن فعال بن جاتا ہے۔ چنانچہ کراچی کے مضافات میں میمن گوٹ چلے گئے اور مسجد میں قیام کیا۔ تقی میاں (جسٹس محمد تقی عثمانی) بھی ہمراہ تھے۔

اتفاق سے حضرت مفتی صاحب کو عرق النساء کا درد اٹھا اور اتنا شدید کہ وہاں مزید قیام ممکن نہ رہا۔ چنانچہ دوسرے روز ہی واپس آنا پڑا۔

ایک روز حضرت مفتی صاحب نے فرمایا کہ فی الحال بہشتی زیور سامنے رکھ کر مسائل تو لکھنا شروع کرو۔ میں نے کام شروع کر دیا لیکن اپنی پرانی منحوس عادت کے مطابق بے دلی اور سست رفتاری سے۔ ایک دن مفتی صاحب نے مدت اور کام کا جائزہ لیا تو مایوس کن تھا۔ فرمایا: جس زمانے میں مجھے دارالعلوم میں افتاء کا کام سپرد کیا گیا میں اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے یومیہ کام کرتا تھا۔ عمل اور ذمہ داری کے احساس ہی سے آدمی کی قدر ہوتی ہے۔ اب دیکھو! مولانا منتخب الحق صاحب کو میں بعض علوم میں اپنے سے فائق پاتا ہوں لیکن ذمہ داری کا احساس نہ ہونے کی وجہ سے انہوں نے اپنی قدر کھو دی ہے۔ (میں جانتا ہوں کہ مولانا منتخب الحق صاحب جنہیں تمام درسی علوم میں کمال کے ساتھ ساتھ خاص طور پر اصول فقہ میں امامت کا درجہ حاصل تھا، ان کی کیفیت یہ تھی کہ موڈ ہوا تو ایک ایک دن میں اٹھارہ اٹھارہ سبق پڑھا دیئے، موڈ نہ ہوا تو اٹھارہ دن میں ایک سبق بھی نہ پڑھایا۔ جو باکمال حضرات اپنے موڈ کے اس طرح تابع ہوتے ہیں اپنا کمال اپنے ساتھ لے کر رخصت ہو جاتے ہیں، ان کی کوئی قابل ذکر علمی یادگار باقی نہیں رہتی اور یہی حال مولانا منتخب الحق صاحب کا تھا) ۔ فرمایا: دارالعلوم میں اور بھی اساتذہ ہیں، آخر یہ کام میں نے تمہارے ہی سپرد کیوں کیا؟ اس لئے کہ تمہارے اندر لکھنے کی صلاحیت پاتا ہوں، لیکن تم ہو کہ کام کر کے ہی نہیں دیتے۔ مفتی صاحب

نے مزید فرمایا کہ: عالم کے تین کام ہوتے ہیں: پہلا امامت، دوسرا تدریس جو امامت سے افضل ہے اور تیسرا تصنیف و تالیف جو سب سے افضل ہے، کیونکہ اس کا نفع پائیدار ہوتا ہے۔

میرا کام اگرچہ فتویٰ نویسی تھا لیکن ملازم میں دارالعلوم کا تھا۔

ناظم دارالعلوم مولانا نور احمد مرحوم کی کسی بات پر ناراض ہو کر ایک مرتبہ میں نے تحریری استعفاء پیش کر دیا۔ یہ رمضان کا آخری عشرہ تھا اور حضرت مفتی صاحب آرام باغ کی مسجد میں معتکف تھے۔ ناظم صاحب مجھے لے کر حضرت کے پاس مسجد میں پہنچے اور میری تحریر پیش کی۔ فرمایا: ابھی رکھو رمضان کے بعد اس کا فیصلہ کریں گے۔

حضرت مفتی صاحب دراصل حکیمانہ اسلوب سے اس وقت بات کو ٹالنا چاہتے تھے، یہ جان کر کہ یہ غصے کا اثر ہے اور رمضان میں بات بات پر غصہ آ ہی جاتا ہے۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ جب غصہ فرو ہو گا تو بات خود بخود ختم ہو جائے گی۔ چنانچہ یہی ہوا کہ نہ میں نے وہ تحریر واپس لی اور نہ وہ منظور ہوئی۔

دارالعلوم میں جب تک رہا یہ وضع رہی: ڈاڑھی اور مونچھیں سکھوں کی طرح چڑھی ہوئیں اور بدن پر شلوار اور کالر دار قمیص۔ ظاہر ہے کہ یہ مولویوں کی وضع نہیں اور اسی وضع سے ناظم صاحب بجا طور پر چڑھتے اور ٹوکتے رہتے تھے، اور میں ہمیشہ انہیں یہ جواب دیتا تھا کہ یہ وضع تو اس وقت چھوڑوں گا جب اللہ کا خوف دل میں پیدا ہو گا، آپ کے کہنے سے تو چھوڑنے سے رہا۔

لیکن اللہ عزیق رحمت فرمائے حضرت مفتی صاحب کو کہ فتاویٰ کے سلسلے میں روزانہ حاضرِ خدمت ہونے کے باوجود دو سال کے عرصہ میں میری اس وضع کے بارے میں کبھی ایک لفظ بھی نہیں فرمایا۔

جب میرا تقرر ایس۔ ایم۔ کالج کراچی میں ہوا تو میری موجودگی میں ناظم

صاحب نے حضرت مفتی صاحب سے کہا: حضرت اب تو یہ کالج کے مولوی ہو گئے۔
مقصد تھا... کریلا اور نیم چڑھا۔

اللہ تعالیٰ حضرت مفتی صاحب کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، ایسی بات فرمائی کہ جب بھی خیال آتا ہے بعض مرتبہ آنکھیں ڈبڈبا آتی ہیں۔ اور اس وقت بھی یہی کیفیت ہے جب کہ یہ سطور لکھ رہا ہوں۔ فرمایا: دیکھو مولوی نور احمد، جہاں تک ان کے ظاہر کا تعلق ہے یہ ہمیشہ سے کالج کے مولوی ہیں، مدرسے کے کبھی نہیں رہے۔ لیکن جہاں تک باطن کا تعلق ہے یہ ہمیشہ مدرسے کے مولوی رہیں گے، کالج کے کبھی نہ ہوں گے۔ حضرت مفتی صاحب کی اس رائے کے بارے میں اس کے سوا اور کیا کہوں اتقوا فراسة المؤمن فإنه ينظر بنور الله، "مومن کی فراست سے ہوشیار رہو، کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے"۔ حضرت مفتی صاحبؒ، مولانا اشرف علی تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کے بارے میں بیان کرتے تھے کہ وہ قسم کھا کر فرماتے تھے کہ مجھے کشف نہیں ہوتا، لیکن اگر ہم قسم کھا کر یہ کہیں کہ ان کے معاملات کشفی ہوتے تھے تو حانث نہیں ہوں گے۔ اپنے تجربات کی روشنی میں اگر میں یہی بات حضرت مفتی صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے بارے میں کہہ دوں تو انشاء اللہ میں بھی حانث نہ ہوں گا۔

جب تک مدرسے میں تھا انفرادیت اور فیشن اس وضع میں تھی جو میں نے بنا رکھی تھی۔ کالج پہنچا تو وہاں ایک سے ایک فیشن ایبل موجود تھے۔ سوچا کہ اب اپنی انفرادیت اسی میں ہے کہ پرانی وضع کی طرف لوٹ جاؤں۔ چنانچہ چند ہی دنوں میں کرتہ پاجامہ اور شیروانی اختیار کر لی۔ لیکن ڈاڑھی اور مونچھوں کی وضع قائم رہی، تاآنکہ قسمت مجھے ایک مرتبہ حضرت شاہ زوار حسین رحمتہ اللہ علیہ کے پاس خیرپور ٹامے والی لے گئی اور وہاں تقریباً ایک ہفتہ قیام رہا۔ ایک روز بال بنانے بیٹھا، آئینہ سامنے کیا تو خیال ہوا جس علم کی طرف میری نسبت ہے، برائے نام ہی سہی، یہ وضع اس کے

مناسب نہیں ۔ اس وقت سے آج تک مونچھ نیچی اور ڈاڑھی سیدھی ہے اگرچہ خود آج تک سیدھا نہ ہو سکا ۔

دارالعلوم کی ملازمت کے دوران مجھے ۱۲۵ روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی ۔ اس قلیل تنخواہ میں ایک بیوی اور تین بچوں کے ساتھ کیا گزر ہوتا اور بیوی بھی ایسی کشادہ دست کہ ماشاء اللہ ۔ حضرت مفتی صاحب مرحوم کو جب میری پریشان حالی معلوم ہوئی تو میرے لئے پچاس روپے ماہوار کا مزید انتظام فرمادیا اس طرح کہ جدید طرز پر راست طریقہ (Direct Method) سے بالغوں کو پڑھانے کے لئے دارالعلوم اور "الطریقۃ الجدیدۃ" کے مؤلف استاد امین المصری کے تعاون سے جو مدارس قائم کئے گئے تھے ان میں مدرس لگادیا ۔ لیکن آمدنی کے تناسب سے مصارف بھی بڑھ گئے اور نتیجہ وہی رہا کہ نہ پریشانی میں کمی ہوئی اور نہ قرض لینے کی قبیح عادت سے چھٹکارا نصیب ہوا ۔

کبھی کبھی تو مجھے خیال آتا ہے کہ میری سابقہ تنگ دستی اور پریشانی شاید قرض لینے ہی کی وجہ سے تھیں ، کیونکہ حدیث میں ہے **من فتح باب مسالة فتح الله عليه باب فقر** (جو سوال کا دروزاہ کھول لیتا ہے اللہ اس پر فقر کا دروازہ کھول دیتا ہے) ۔

بہرحال جب مفتی صاحب کے علم میں آیا کہ میری پریشانی بدستور ہے تو ایک روز فرمانے لگے : معلوم ہوتا ہے تم اور تمہاری بیوی دونوں پھوہڑ ہو ۔ مجھے دیکھتے ہو کتنا بڑا کنبہ لئے بیٹھا ہوں اور خرچ جانتے ہو کیا ہے ؟ تین سو روپے ماہوار ۔

جب میں نے ایس ۔ ایم ۔ کالج میں ملازمت کا ارادہ کیا تو حضرت مفتی صاحب نے ایک کاغذ پر اپنی انگلی سے تین جگہ اوپر ، درمیان میں اور نیچے کچھ لکھا اور فرمایا کہ اس پر لکھ کر درخواست دے دو ۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے وہ ملازمت دلا دی ۔ گویا دارالعلوم سے کالج کی طرف منتقل ہونا بھی حضرت ہی کی مرضی اور تصرف سے ہوا ۔

دارالعلوم سے ایس ۔ ایم ۔ کالج منتقل ہوئے شاید ایک سال ہی ہوا ہو گا کہ

ایک صاحب کے لئے حضرت مفتی صاحب سے سفارش کے طور پر خط لکھوانے گیا۔ فرمایا! آپ انہیں جانتے ہیں؟ میں نے جواب دیا: بہت اچھی طرح۔ قلم اور پیڈ اٹھایا اور میرے حوالے سے ان کے لئے سفارشی خط لکھنے کا ارادہ کیا۔ لیکن دیکھا کہ قلم ہاتھ میں ہے اور حضرت کچھ سوچ رہے ہیں۔ پھر نظریں اٹھائیں اور مجھ سے دریافت فرمایا: آپ کا نام؟ میں نے نام تو بتا دیا لیکن ایک دھچکا سا لگا کہ دو سال تک مفتی صاحب کی خدمت میں رہا ہوں اور اتنا نالائق اور ناقابل التفات ہوں کہ اس قلیل عرصے میں حضرت میرا نام بھی بھول گئے۔ نام سن کر خط لکھنے کے لئے گردن جھکائی لیکن ایک لفظ بھی نہ لکھا تھا کہ دوبارہ نظریں اٹھائیں اور فرمایا: اب دیکھئے آپ کا نام بھول رہا ہوں، یہ ایسا ہے جیسے کوئی شخص اپنا نام بھول جائے۔ حضرت کی زبان سے یہ سن کر سارا غبار دھل گیا۔

حضرت مفتی صاحب اور ان جیسے بعض دوسرے بزرگوں کو بھی دیکھا ہے کہ ان پر خلوت در انجمن کی کیفیت غالب رہتی تھی۔ نظر کسی طرف ہے، باتیں کسی سے کر رہے ہیں۔ کسی بھی کام میں مصروف ہیں مگر دھیان دل کی طرف ہے، اس پنھیاری کی طرح جس کے سر پر نیچے اوپر پانی کے بڑے چھوٹے تین تین برتن رکھے ہوں۔ وہ راستے کے نشیب و فراز دیکھ کر بھی چلتی ہے اور سہیلیوں سے باتیں بھی کرتی جاتی ہے لیکن چت برتنوں کی طرف رہتا ہے۔ گرنا تو کجا، مجال ہے کہ برتن چھلک بھی جائے۔

اس کیفیت کا اندازہ بعض مرتبہ اس سے بھی ہوتا تھا کہ کبھی کبھی مفتی صاحب ہماری طرف اس طرح مخاطب ہوتے تھے جیسے کوئی اندر سے باہر آرہا ہے، جیسے آٹے میں سے آہستہ آہستہ بال کھینچا جارہا ہے۔

ایک روز حضرت کے مکان پر حاضر تھا۔ فون آیا، میں نے پوچھا کون؟ جواب ملا: سلیمان۔ میں نے حضرت سے کہا سلیمان نامی کسی صاحب کا فون ہے۔ گھبرا کر فرمایا: سید صاحب کا فون ہے (سید سلیمان ندوی مرحوم) اور اس طرح مؤدب ہو کر فون پر

باتیں کرنے لگے جیسے سید صاحب مرحوم سامنے بیٹھے ہوں۔

ایک مرتبہ دارالعلوم نانک واڑہ کے دفتر میں سید سلیمان ندوی صاحب، مفتی محمد شفیع صاحب اور دوسرے کچھ حضرات تشریف فرماتھے، میں بھی موجود تھا۔ سید صاحب نے ایک کتاب اٹھائی اور اس میں غرق ہوگئے۔ہوش بھی نہ رہا کہ کہیں اور بھی جانا ہے۔ حضرت مفتی صاحب ان کے قریب ہی دوزانو بیٹھے تھے جیسے کوئی شاگرد (پرانے زمانے کا) اپنے استاد کے سامنے بیٹھا ہو۔ کسی نے مفتی صاحب سے چلنے کا اشارہ کیا، مفتی صاحب نے اشارے ہی سے جواب دیا کہ سید صاحب تو کتاب میں منہمک ہیں، ایسی حالت میں کون یہ کہنے کی جرأت کرے کہ چلئے۔

حضرت مفتی صاحب دل کے دورے سے (غالباً) ابھی پوری طرح سنبھلے بھی نہ تھے کہ ان کے بڑے صاحبزادے ذکی میاں کے انتقال کی روح فرسا خبر پہنچی۔ بڑا بیٹا اور بھی اتنا سعادت مند کہ باید وشاید۔ میں بھی تعزیت کے لئے حاضر ہوا، اندر بلالیا۔ فرمایا: طبعی عمر کے مطابق لوگوں کو میری تعزیت کے لئے اس کے پاس جانا چاہیے تھا، لیکن اللہ کی مصلحت کہ اس کی تعزیت کے لئے میرے پاس آرہے ہیں۔فرمایا: اس کمرے میں جب تنہا ہوتا ہوں تو ذہن میں لوگوں کی یاد اس طرح آتی ہے جیسے پردہ، فلم پر تصویریں۔ میری عادت یہ ہے کہ جب بھی کسی کی یاد آتی ہے اسی وقت اس کے لئے دعا کر دیتا ہوں، کبھی کبھی آپ کی یاد بھی آتی ہے اور عادت کے مطابق آپ کے لئے بھی اسی وقت دعا کر دیتا ہوں۔

یہ سن کر میرے آنسو نکل آئے۔ میں اس زمانے میں ایم۔اے کر چکا تھا اور یونیورسٹی میں ملازم تھا۔ سوچا کہ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے بڑا تیر مارا، حالانکہ جو کچھ ہو رہا ہے نہ معلوم کن کن حضرات کی دعاؤں سے ہو رہا ہے۔

ایک مرتبہ اساتذہ میں مفت تقسیم کرنے کے لئے کچھ کتابیں دارالعلوم میں آئیں۔ جو کتابیں میرے حصہ میں آئیں ان میں ایک کتاب علمِ رمل سے متعلق بھی تھی

ناظم صاحب نے فرمایا: آپ اس کتاب کا کیا کریں گے؟ حضرت نے فرمایا: کسی عالم سے یہ نہیں پوچھا جاسکتا کہ وہ کسی کتاب کا کیا کرے گا۔ عالم کو نہ معلوم کس کتاب کی کس وقت ضرورت پیش آجائے۔

ایک روز فرمایا: جدید تعلیم یافتہ طبقے کو اسلام کی طرف مائل کرنے کا جو ڈھنگ مولانا مودودی کو آتا ہے ہمیں نہیں آتا۔ لیکن جب وہ اسلام کی طرف مائل ہو جائیں تو ان کی صحیح اسلامی تربیت کا جو ڈھنگ ہمیں آتا ہے انہیں نہیں آتا۔

ایک روز فرمایا: دیوبند کے دو حضرات جب حج سے واپس آئے تو ہم ملنے گئے۔ مزاج پرسی پر ایک صاحب حج کی کلفتوں اور بدوؤں کی طرف سے پہنچی ہوئی تکلیفوں کا دکھڑا سنانے لگے۔ دوسرے صاحب کے پاس پہنچے تو انہوں نے تمام تر اللہ کی رحمتوں اور نوازشوں کا ذکر کیا۔ ہم نے ان سے دریافت کیا کہ کیا آپ کو بدوؤں سے تکلیفیں نہیں پہنچیں؟ جواب دیا: جب محبوب کے دروازے پر جاتے ہیں تو دربانوں کی جھڑکیاں تو سننی پڑتی ہیں، ان کا کیا ذکر۔

حضرت مفتی صاحب رحمتہ اللہ کے انتقال پر میں بھی دارالعلوم پہنچا۔ آخری دیدار کے لئے لائن بڑی لمبی اور سخت گرمی تھی۔ میں تھوڑی دیر کے لئے مسجد میں جاکر حضرت کی روح کو ثواب پہنچانے کے لئے تلاوت میں مشغول ہوگیا۔ تلاوت کے بعد مراقبے کے لئے آنکھیں بند کرلیں۔ ربودگی کی کیفیت طارت ہوئی۔ دیکھا کہ کوئی صاحب مجھ سے دریافت کررہے ہیں کہ کیا تم نے "سورۃ النورین" دیکھی ہے؟ میں نے جواب دیا کہ نہیں۔ کہا کہ یہ ہے۔ انہوں نے کتاب کھولی۔ کتاب ایسی تھی جیسے مہاجنوں کی بہی، کہ لمبی زیادہ چوڑی کم۔ میں نے کہا، لاؤ میں پڑھوں۔ انہوں نے کہا کہ تم کیسے پڑھو گے یہ تو مرہٹی زبان میں لکھی ہوئی ہے، میں سناتا ہوں۔ میں نے دیکھا کہ وہ سورۃ ایک صفحے کے نصف سے شروع ہوکر سامنے کے صفحے کے نصف سے کچھ زیادہ پر ختم ہوتی تھی۔

اس کے بعد یہ منظر دیکھا کہ ایک وسیع خوبصورت کمرہ ہے اس میں کافی اونچی ایک مسہری بچھی ہے۔ سرہانے اونچا سا ایک گاؤتکیہ ہے اور حضرت مفتی صاحب سبز عمامہ باندھے گاؤتکیہ سے ٹیک لگائے نیم دراز ہیں اور پیروں پر ایک ریشمی لحاف (غالباً سبز رنگ کا) پڑا ہے۔ اور اسی حال میں یہ الفاظ (بعینہٖ) میری زبان پر آئے " علی سررٍ متکئین "۔

مراقبے سے فارغ ہو کر جس میں زیادہ دیر نہ لگی تھی حضرت رحمتہ اللہ علیہ کا آخری دیدار کیا۔ وہ نورانی صورت آج بھی نظروں میں بسی ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان پر اپنی ہزاروں رحمتیں نازل فرمائے۔ آمین۔

حضرت مولانا منتخب الحق صاحب مرحوم

استاد گرامی حضرت مولانا منتخب الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے تعارف کی ابتدا ٹونک میں ہوئی جب کہ مولانا مدرسہ خلیلیہ میں صدر مدرس تھے اور میں فراغت کے بعد معاش کی تلاش میں ٹونک پہنچا تھا اور محکمہ شرعیہ میں مفتی کی حیثیت سے ملازمت کا امیدوار تھا۔

مولانا کی شاگردی کی باقاعدہ سعادت تو اس وقت حاصل ہوئی جب میں نے کراچی یونیورسٹی سے ایم۔اے کیا۔لیکن ٹونک کے قیام کے دوران بھی مولانا کے مسلم الثبوت کے درس میں چند روز شریک ہوا۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا کو قوی حافظہ اور اس سے زیادہ ثاقب ذہن عطا فرمایا تھا۔ عالمانہ فضل و کمال کے ساتھ شعروادب کا ذوق بھی بہت بلند تھا۔اسی لئے ٹونک کے شعراء اور خاص طور پر بسمل صاحب اور صولت صاحب عرف کلّو میاں، جو ٹونک کے معروف شعراء میں سے تھے، مستقلاً مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے۔دونوں کے درمیان دوستی کے ساتھ ساتھ معاصرانہ چشمک بھی تھی۔

ایک مرتبہ بسمل صاحب نے مولانا کو اپنا یہ قطعہ سنایا:

ساقی وہ تیرے میکدے والے کہاں گئے
وہ شال وہ ردا وہ دوشالے کہاں گئے

رکھا ہے آبخوروں میں پانی بھرا ہوا
جن میں شراب تھی وہ پیالے کہاں گئے

ٹکو میاں کہاں خاموش رہنے والے تھے۔ برجستہ کہا

ساقی وہ تیرے - - - - - - - - - -

وہ شال - - - - - - - - - - -

بہنوئی بننے والا مصیبت میں اب نہیں
وہ عیش کے زمانے کے سالے کہاں گئے

مولانا کی علمی نسبت خیر آبادی خاندان سے تھی اور اسی مناسبت سے ان پر منطق، قدیم فلسفہ، علم کلام اور اصول فقہ کا غلبہ تھا۔ اصول فقہ کی حد تک میں اپنے تجربے کی روشنی میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ اپنے زمانے میں اس فن کے امام تھے، ویسے تفسیر، حدیث، نحو و صرف، معانی و بیان، جس فن پر بھی گفتگو کرتے تھے اس رسوخ اور بصیرت کے ساتھ گفتگو کرتے تھے گویا یہی ان کا خاص فن ہے۔

گفتگو کے دوران ان کی آنکھوں کی حرکت بتاتی تھی کہ مولانا اپنی زبان سے نہیں دماغ سے بول رہے ہیں۔ ہر گفتگو، خواہ وہ نجی مجلس میں ہو یا حلقہ درس میں یا کسی پبلک جلسہ میں، انتہائی مربوط اور بلیغ ہوتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ تقریر نہیں تحریر ہے اور تحریر بھی ایسی جس میں الفاظ نگینوں کی طرح جڑے ہوئے ہوں۔ اسی لئے حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے میرے سامنے ایک مرتبہ فرمایا "مولانا منتخب الحق تو متن بولتے ہیں۔"

تقشف کو ان سے کوئی مناسبت نہ تھی، بہت زندہ دل اور بے تکلف انسان تھے۔ طلبہ سے بھی اس طرح باتیں کرتے تھے جیسے دوستوں سے باتیں کر رہے ہوں۔

مولانا کو مطالعے کا بے انتہا شوق تھا اور مطالعہ کرتے تھے تو کتاب میں غرق ہو جاتے تھے۔ ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا کہ میں نے اتنی کتابیں پڑھیں ہیں کہ تم نے سنی بھی نہ ہوں گی۔ اور یہ بات بالکل درست ہے۔

کراچی پہنچنے کے بعد مولانا ہی مجھے لے کر حضرت مفتی محمد شفیع صاحب کے

پاس پہنچے اور ان ہی کے توسط سے پاکستان میں پہلی ملازمت کا آغاز ہوا۔ ان دنوں مولانا اردو کالج میں پروفیسر تھے، پھر کراچی یونیورسٹی میں لے لئے گئے۔

میں دارالعلوم سے ایس۔ ایم۔ کالج منتقل ہوا اور اسی دوران ایم۔ اے کر لینے کے بعد میرا تقرر سندھ یونیورسٹی میں ہو گیا۔ سندھ یونیورسٹی میں ایک سال ہی گذرا تھا کہ یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات میں، جس کے صدر مولانا خود تھے، لکچرر شپ کی آسامی خالی ہوئی۔ میں نے درخواست دی اور انٹرویو کے لئے کراچی پہنچا۔ غرۃ یہ تھا کہ صدر شعبہ تو میرے استاد ہیں، میرے تقرر کو کون روک سکتا ہے۔ انٹرویو سے قبل مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا، فرمایا: مولانا رشید ارشد صاحب شعبہ عربی میں پریشان ہیں اور تم سندھ یونیورسٹی میں مطمئن ہو۔ لہذا ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس مرتبہ مولانا ارشد کو لیں گے، پھر کسی اور موقع پر تمہیں۔ میں نے اپنے دل میں کہا: "جن پر تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے"۔ میں نے عرض کیا: پھر آپ فرمائیں تو میں انٹرویو میں شرکت نہ کروں۔ فرمایا: جب آئے ہو تو انٹرویو میں شریک ہو جاؤ۔ میں واپس چلا آیا لیکن پریشان تھا کہ میرے ساتھ تو اللہ تعالیٰ کا ہمیشہ سے یہ معاملہ رہا ہے کہ میں جب بھی ملازمت لے لئے کسی انٹرویو میں شریک ہوا کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ناکامی کا منہ دیکھا ہو۔ بہر حال انٹرویو ہوا اور انٹرویو ختم کر کے باہر نکلتے ہی مولانا نے فرمایا کہ تمہیں لے لیا گیا اور ارشد صاحب رہ گئے۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ اگر مولانا یہ فرما دیتے کہ تم انٹرویو میں شرکت نہ کرو تو میں یقیناً شرکت نہ کرتا اس لئے کہ مولانا ارشد صاحب میرے استاد تھے اور میرے علم میں تھا کہ وہ شعبہ عربی کے صدر ڈاکٹر یوسف صاحب مرحوم کے طرزِ عمل سے پریشان بھی تھے۔

بہر حال شاگردی کے بعد ایک ہی شعبہ میں مولانا کے ساتھ کام کرنے کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔ شعبہ اسلامیات میں میرے تقرر کے بعد مولانا کے اور خود میرے دماغ پر بھی مولانا ارشد صاحب کی پریشانی مسلسل چھائی رہی۔ شعبہ میں کام

کرتے ہوئے شاید دو سال ہی گذرے ہوں گے کہ ایک روز میں نے مولانا سے عرض کیا کہ اگر آپ فرمائیں تو میں ڈاکٹر یوسف صاحب سے بات کروں کہ وہ ارشد صاحب کے شعبہ اسلامیات میں منتقل ہونے پر آمادہ ہو جائیں۔ مولانا کے علم میں تھا کہ ڈاکٹر یوسف صاحب مرحوم مجھ پر بہت شفیق تھے اور میرا شمار ان کے چہیتے شاگردوں میں تھا، اجازت دے دی۔ میں نے ڈاکٹر صاحب مرحوم سے عرض کیا کہ مجھے شعبہ عربی میں لے لیں اور ارشد صاحب کو میری جگہ شعبہ اسلامیات میں جانے کی اجازت دے دیں۔ ڈاکٹر صاحب آمادہ ہو گئے۔ میں یہ خوشخبری سنانے مولانا کے مکان پر پہنچا۔ مولانا سے عرض کیا تو فرمایا: میں تمہاری قیمت پر ارشد صاحب کو لینے کے لئے کسی صورت تیار نہیں۔ تمہارے رہتے ہوئے اگر وہ شعبہ میں آسکتے ہیں تو آجائیں اور اگر تمہیں جانا ہی ہے تو استعفاء دے کر چلے جاؤ۔ ارشد صاحب کے لئے بہتری کی جو صورت پیدا ہوئی تھی اس کے ختم ہونے، اپنی بات جانے اور ڈاکٹر یوسف صاحب کے سامنے شرمندہ ہونے کے خیال سے مجھے اتنا غم ہوا کہ آنسو نکل آئے۔ میں نے کہا: مولانا! جب تک باپ زندہ تھے اتنی بات میرے استعفاء دینے کے لئے کافی ہوتی تھی، اب جاکر بچوں سے پوچھتا ہوں کہ کتنے دن فاقہ برداشت کر سکتے ہو، اس کے بعد جواب دوں گا۔ یہ کہتے ہوئے میری آواز بھی بلند ہو گئی۔ مولانا نے فوراً اٹھ کر دروازے بند کئے اور فرمایا: جو کچھ کہنا چاہتے ہوں دل کھول کر کہہ لو۔ میں نے بھی جی بھر کر بھڑاس نکالی۔

بالآخر نتیجہ وہی "ڈھاک کے تین پات" ہوا۔ کہ میں اور مولانا ارشد صاحب دونوں اپنی اپنی جگہ رہے۔ مولانا ارشد صاحب کو جب اس واقعہ کا علم ہوا تو وہ مولانا سے کبیدہ خاطر ہوگئے، اور میری طرف سے ان کے دل میں ایم۔اے کی فیرویل پارٹی کے بعد سے جو تکدّر تھا وہ بالکل ختم ہو گیا۔ اس کے بعد سے مولانا ارشد صاحب مجھے اپنے لائق ترین شاگردوں میں سے شمار کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

شعبہ اسلامیات میں ملازمت کے دوران میں نے پی ایچ۔ڈی میں داخلہ لیا اور

ڈائریکٹر مولانا کو بنایا۔ حکیم ترمذی کی "کتاب شان الصلوۃ" کو ایڈٹ کرنا طے پایا، جس کی ضخامت شاید سو صفحات سے بھی کم تھی۔ ایک روز مولانا نے فرمایا: میں سمجھتا ہوں کہ اس کام میں تمہارے چار سال صرف ہو جائیں گے۔ میں نے کہا: مولانا! ڈاکٹریٹ کی ڈگری کیا میں مرنے کے بعد اللہ کو دکھانے کے لئے لینا چاہتا ہوں۔ فرمایا: اچھا آپ جلد از جلد پروفیسر بننا چاہتے ہیں۔ میں نے عرض کیا: پروفیسر بنوں یا نہ بنوں، لیکن جلد از جلد ڈاکٹر ضرور بننا چاہتا ہوں۔ خاموش ہو گئے۔ مولانا کو ڈائریکٹر بنانا دراصل اتمامِ حجت کے لئے تھا، ورنہ میں جانتا تھا کہ مولانا کو صرف مطالعے سے دلچسپی ہے، تصنیف و تالیف سے کوئی دلچسپی نہیں۔ جو لوگ مجھ سے پہلے سے مولانا کے زیرِ نگرانی پی ایچ۔ڈی کے مقالے لکھ رہے تھے انہیں اپنی تحریریں دکھانے کے لئے مولانا بڑی مشکل سے اور بڑی خوشامدوں کے بعد وقت دیا کرتے تھے۔

اقبالیات کے ماہر مولانا یوسف سلیم چشتی مرحوم نے خود مجھ سے فرمایا کہ مجھ جیسا شخص ہی تھا جو مولانا منتخب الحق صاحب سے اگلوا سکا۔ مولانا چشتی ایک زمانے میں مولانا سے اقبال کے اشعار کا مطلب سمجھا کرتے تھے اور کئی کئی چکر کاٹنے کے بعد مولانا انہیں مشکل ہی سے وقت دیتے تھے، وہ بھی اس طرح کہ ایک گھنٹے کی نشست میں کام کی باتوں پر صرف پندرہ منٹ صرف ہوں۔

بہر حال میں نے اتمامِ حجت کے بعد ڈاکٹر سید محمد یوسف صاحب مرحوم کو اپنا ڈائریکٹر مقرر کیا۔ موضوع وہ تھا جو بعد میں "اصولِ فقہ اور شاہ ولی اللہ" کے عنوان سے شائع ہوا۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم باتوں کے بجائے کام کے دھنی تھے۔ تصنیف و تالیف سے انہیں گہری دلچسپی تھی۔ چونکہ خود پی ایچ۔ڈی اور کئی کتابوں اور مضامین کے مؤلف تھے، اس لئے تحقیق کی تکنیک تو جانتے تھے لیکن اصولِ فقہ سے انہیں کوئی مناسبت نہ تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ اصولِ فقہ کے مسائل میں جہاں مجھے دشواری پیش آتی تھی، مولانا منتخب الحق صاحب کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا۔ مولانا اور ڈاکٹر صاحب کے

درمیان عداوت کی حد تک تنافر تھا۔ لیکن مولانا کی عالی ظرفی دیکھی کہ جب بھی ان کی طرف رجوع کیا، کبھی پیشانی پر بل بھی نہ آیا، نہایت خندہ پیشانی اور کشادہ دلی سے مسئلے پر تقریر کی اور گتھیوں کو سلجھایا۔ پی ایچ۔ ڈی کا طالب علم جو دیوبند کا فارغ التحصیل بھی ہو اور خود مدرس بھی، وہ دقیق مسائل کے سوا کسی پیش پاافتادہ مسئلے میں نہیں الجھ سکتا۔ لیکن حیرت ہوتی تھی کہ جب بھی کسی دقیق مسئلے میں مولانا کی طرف رجوع کیا موصوف نے فوری طور پر اسے حل کر دیا، جیسے ابھی اسی مسئلے کو دیکھ کر آئے ہوں۔ ہر مسئلے میں ان کے ذہن کو بالکل صاف پایا اور تفہیم میں مولانا کو خاص ملکہ حاصل تھا۔ اصول فقہ کا دقیق سے دقیق مسئلہ ہو، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اس کا جواب دینے میں کچھ سوچنا پڑا ہو۔ صرف ایک بار "مناسبت" کے مسئلے میں فرمایا کہ اس میں ہمارا ذہن صاف نہیں، جو کچھ ہماری سمجھ میں آیا وہ یہ ہے۔ مجھے مولانا کے اس جواب پر کوئی تعجب نہ ہوا، اس لئے کہ "مسلم الثّبوت" کے مصنف تک کو اس موقع پر یہ لکھنا پڑا کہ "قوم کا کلام اس مسئلہ میں واضح نہیں، جو میں سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے۔"

ڈاکٹر یوسف صاحب مرحوم ڈائریکٹر سہی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر مولانا کی رہنمائی مجھے میسر نہ آتی تو مقالے کی تکمیل میرے لئے آسان نہ تھی اور اسی لئے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میرے مقالے کے ڈائریکٹر بظاہر ایک تھے اور حقیقتاً دو۔

مولانا کو اصولِ فقہ میں اتنا کمال حاصل تھا اور اس فن کا انہیں اتنا استحضار تھا کہ اگر زبانی بول دیں تو اصول فقہ کی ایک بہترین کتاب تیار ہو جائے۔ لیکن قلم پکڑنا تو کجا، مولانا کو شاید اس سے بھی بیر تھا کہ کوئی شخص ان کی تقریر کو ضبطِ تحریر میں لے آئے۔

حکیم نصیر الدین صاحب جو مولانا سے عمر میں بڑے اور مولانا کے استاد مولانا معین الدین صاحب اجمیری کے بھتیجے ہیں اور اسی تعلق سے مولانا سے محبت بھی بہت کرتے تھے اور مولانا کی لاپروائی پر محبت بھری گالیاں بھی بہت دیتے تھے۔ انہوں نے کئی

بار اپنے گھر پر مولانا کے اصولِ فقہ کے درس کا اہتمام کیا۔ مولانا ماہر القادری مرحوم اور مولانا ظفر احمد صاحب انصاری مرحوم بھی شریکِ درس ہوتے تھے۔ ایک بار حکیم صاحب نے ٹیپ ریکارڈر بھی خرید لیا کہ مولانا کی تقریریں ریکارڈ ہو جائیں، لیکن ہمیشہ یہی ہوا کہ دو چار درس بڑے زور شور سے ہوئے اور اس کے بعد سامعین منتظر ہیں اور مولانا کا کہیں پتہ نہیں۔

ایک مرتبہ جماعت اسلامی کے پروفیسر خورشید احمد صاحب نے مولانا سراج احمد صاحب کو ڈھائی سو روپے ماہوار پر اس کام کے لئے مقرر کیا کہ مولانا کے گھر جایا کریں اور اصولِ فقہ کے سلسلے میں جو کچھ وہ فرمائیں اسے ضبط کر لیا کریں۔ لیکن مولانا نے انہیں کبھی وقت نہ دیا۔

پی ایچ۔ ڈی ہو جانے کے بعد ایک مرتبہ میں نے بڑی درد مندی سے کہا کہ مولانا میں اس خدمت کے لئے تیار ہوں کہ آپ جو کچھ زبانی فرمائیں میں اسے قلمبند کرتا جاؤں۔ حوالے میں بعد میں دے دوں گا اور اس طرح اصولِ فقہ کی ایک اچھی اور مستند کتاب تیار ہو جائے گی۔ فرمایا: آپ کو کیا تکلیف دوں، میں انشاء اللہ رشیدہ (ان کی بیٹی) کو بٹھا کر لکھو[illegible]ع کرتا ہوں۔ چنانچہ واقعتہً رشیدہ سے لکھوانا شروع کر دیا اور استحسان پر تقریباً پندرہ صفحات لکھوائے۔ ایک روز مجھ سے فرمایا کہ جو کچھ میں نے لکھوایا ہے اسے آکر سنو۔ میں حاضر ہوا تو خود ہی پڑھ کر سنایا۔ یہ تو کہنے کی بات ہی نہیں کہ مولانا نے کیا کچھ لکھوایا ہو گا البتہ پورا مضمون سن کر میں نے عرض کیا کہ مولانا! اتنی تفصیل سے کام نہ لیجئے ورنہ کتاب پوری نہ ہو گی۔ فرمایا: نہیں، انشاء اللہ تعالیٰ کتاب پوری کریں گے۔ نہ معلوم یہ میری کالی زبان تھی یا مولانا کی قدیم عادت کہ وہ مضمون وہیں تک محدود رہا، ایک لفظ بھی آگے نہ لکھوایا گیا۔

تدریس میں مولانا کی توجہ کتاب کی طرف کم اور فن کی طرف زیادہ ہوتی تھی۔ فن بھی اس تفصیل سے سمجھاتے تھے کہ جو کچھ ان کے حافظے میں ہے پورا کا پورا طالب

علم کے ذہن میں انڈیل دینا چاہتے تھے۔ نتیجہ ہمیشہ یہ ہوتا تھا کہ کورس کبھی ختم نہ ہوتا تھا، الا ماشاء اللہ۔

مولانا نے ایم۔اے فائنل کے کورس میں اصولِ فقہ کا ایک مستقل پرچہ رکھا ہوا تھا، جس کی تدریس مولانا کی صدارت سے سبکدوشی اور میرے صدر شعبہ ہو جانے کے بعد میرے حصہ میں آئی تھی۔ میں نے ایک دن مولانا سے عرض کیا کہ میرے خیال میں اصولِ فقہ ایک بیکار فن ہے کہ غیر مجتہد کو مجتہد نہیں بناتا اور مجتہد کو اس کی ضرورت نہیں، بلکہ مجتہدین کے طرق استنباط ہی کی روشنی میں یہ فن مرتب ہوا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اس کی مثال فن عروض کی طرح ہے کہ غیر شاعر کو شاعر نہیں بناتا اور شاعر کو اس کی ضرورت نہیں۔

من ندا نم فاعلاتن فاعلات

شعر میگویم بہ از آبِ حیات

میری بات سن کر مولانا خاموش ہو گئے۔

کراچی یونیورسٹی میں جب شعبوں کی صدارت کے لئے روٹیشن (ROTATION) کا نظام نافذ ہوا تو مولانا کے بعد چونکہ میں سب سے سینیئر تھا اس لئے دو سال کی بچہ سقائی میرے حصہ میں آئی۔ مولانا کو یہ اندیشہ ہوا (اور یہ اندیشہ ان کے ایک اشارے سے ظاہر بھی ہوا) کہ کہیں یہ اصولِ فقہ کے پرچے کو نصاب سے خارج نہ کر دے۔ میں نے عرض کیا کہ مولانا آپ مطمئن رہیں، میرا خیال اپنی جگہ ہے لیکن جو نظام آپ کے زمانے سے چلا آرہا ہے، میں اس میں کوئی تبدیلی نہ کروں گا۔

جب سعودی عربیہ کی جامعہ ملک عبدالعزیز شاخ مکہ میں میرا تقرر ہوا (جو اب جامعہ ام القریٰ ہے) تو اصولِ فقہ کے مخطوطات ایڈٹ کرنے کی خدمت ہی میرے نصیب میں آئی۔ پہلے سال ہی تعطیلات میں جب میں کراچی پہنچا تو مولانا نے فرمایا: دیکھئے آپ تو اصولِ فقہ کو ایک بیکار فن سمجھتے تھے اور اللہ نے آپ کی روزی ہی اس فن

کی خدمت میں مقرر کی ہے۔

میں جس زمانے میں ایس۔ایم۔کالج میں ملازم تھا ایک مرتبہ بس میں مولانا کے ساتھ ان کے گھر، بہار کالونی جمشید روڈ جارہا تھا۔ میں نے ٹکٹ لے لیا۔ فرمایا کہ میں ایک بار اپنے چچا کے ساتھ بس ہی میں سفر کر رہا تھا۔ میں نے ٹکٹ لیا تو چچا نے فرمایا: بڑے جب ساتھ ہوں تو چھوٹے ٹکٹ نہیں لیا کرتے۔ اس کے بعد مولانا کے ساتھ سفر کرتے ہوئے میں نے کبھی ٹکٹ نہیں لیا۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ تمہیں مجلس میں بات کرنے کا سلیقہ نہیں ہے۔ انکساری نہیں، سو فیصد حقیقت ہے کہ مولانا کی یہ رائے بالکل درست ہے۔ آج تک یہ کیفیت ہے کہ بسا اوقات مجلس ختم ہونے کے بعد پچھتاتا ہوں کہ میں نے مجلس میں یہ بات کیوں کہی۔

بس کے اسی سفر میں، میں نے گرومندر کے قریب مولانا سے کہا: مولانا! اللہ شاہد ہے کہ میں نے آپ کے لئے بارہا نمازوں کے بعد دعا کی ہے کہ اللہ نے آپ کو جیسا علم عطا فرمایا ہے، ویسا ہی عمل بھی عطا فرمائے۔ مولانا پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ بات ہی ایسی تھی اور یہ خود علامت ہے اس بات کی کہ مجھے بات کرنے کا سلیقہ نہیں۔ تھوڑی دیر سکوت کے بعد فرمایا: آپ کس سے بیعت ہیں؟ میں نے جواب دیا: شاہ زوّار حسین صاحب سے۔ فرمایا: اس مرتبہ جب وہ تشریف لائیں تو مجھ سے ملاقات کرا دیجئے۔

حضرت شاہ صاحب جب کراچی تشریف لائے تو میں نے سوچا کہ ایک استاد ہیں دوسرے پیر، کس کو کس کے پاس لے جاؤں پھر یہ صورت اختیار کی کہ دونوں کو سندھ مدرسے میں اپنے مکان پر ناشتے پر مدعو کر لیا۔ ناشتے کے بعد میں انوجیلیشن کے لئے چلا گیا۔ ان دنوں سالانہ امتحانات ہو رہے تھے۔ دوپہر کو واپس آیا تو دونوں حضرات تشریف فرما تھے۔ بیوی نے کھانا تیار کر لیا تھا۔ نماز سے فارغ ہو کر میں پھر دوسری شفٹ کے انوجیلیشن کے لئے چلا گیا۔ عصر کے وقت واپس آیا تو دیکھا دونوں حضرات

اب بھی محو گفتگو ہیں۔ چائے پی، اس کے بعد دونوں حضرات رخصت ہوئے۔

بعد میں حضرت صوفی محمد احد صاحب نے بتایا کہ اسی مجلس میں مولانا منتخب الحق صاحب نے حضرت شاہ صاحب کے ہاتھ پر بیعت بھی کر لی تھی۔ لیکن شاید یہ بیعت وقتی تاثر کا نتیجہ تھا، کیونکہ شاہ صاحب سے مولانا کا تعلق استوار نہ رہا۔

مولانا مشکل ہی سے کسی دوسرے کے علم کا لوہا مانتے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ ان جیسے صاحبِ فضل و کمال مجھے کم ہی نظر آئے۔ البتہ مولانا عبدالعزیز میمن مرحوم کی بڑی عزت کرتے تھے۔ میں نے خود مولانا کی زبان سے سنا ہے کہ مولانا میمن تو سلطان العلماء ہیں۔

یہ بات مجھ سے خود مولانا نے بیان کی کہ ان سے مولانا میمن نے فرمایا: دیکھو منتخب الحق، تم میرے بڑے بیٹے کی عمر کے ہو۔ میرے دماغ میں بہت کچرا بھرا ہے۔ اگر تم اس کچرے ہی کو سمیٹ لو تو اچھا خاصا پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ تیار ہو جائے۔ میں تمہیں دمشق سے یا کسی اور عرب یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری دلا دوں گا۔ لیکن مولانا کو تو تصنیف و تالیف سے گویا چڑ سی تھی۔ بات ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دی۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ میمن صاحب کے فضل و کمال کا اعتراف تو ایک طرف لیکن مولانا اس عمر میں خود اپنے فضل و کمال کے ساتھ ان کی شاگردی اختیار کر لیں، یہ بھی مولانا کو گوارا نہ ہوگا، کیونکہ جہاں تک عربی ادب کا تعلق ہے برصغیر پاک و ہند میں میمن صاحب کا کوئی ثانی نہ تھا، لیکن دوسرے علوم میں مولانا ان سے کہیں فائق تھے۔

مولانا منتخب الحق صاحب کا خط بھی بڑا پاکیزہ تھا۔ میں نے انہی کی تحریروں کو سامنے رکھ کر ان کے خطِ شکست کی کافی عرصہ تک مشق کی ہے پھر بھی ان جیسی بات پیدا نہ کر سکا۔

مولانا نے فرمایا کہ انہوں نے ایک مرتبہ حضرت ابراہیم نخعی کو خواب میں

دیکھا۔ حضرت نخعی نے ان کے استاد مولانا معین الدین صاحب سے فرمایا: میں نے اس لڑکے کو اپنی شاگردی میں لے لیا۔ فرمایا: صحابہ میں سے حضرت اسامہ بن زیدؓ کو خواب میں دیکھا ہے، ان کے سوا کسی صحابی کو خواب میں نہیں دیکھا اور نہ کبھی خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

ایک مرتبہ مولانا نے گم شدہ چیز کے لئے ایک دستک کا عمل بتایا۔ عمل حسب ذیل ہے:

شیخ محمود پشمینہ پوش کشکینہ خوار
دستک شصت پیادہ و ہفتاد سوار

فلاں چیز گم شدہ راز ود بیار زود بیار زود بیار

تیسری بار جب "زود بیار" کہا جائے تو دونوں ہاتھوں سے تین بار تالی بجائی جائے۔ پہلی بار زور سے تالی بجی تو جلد، دوسری بار زور سے بجی تو تاخیر سے، اور تیسری بار زور سے بجی تو زیادہ تاخیر سے چیز ملے گی۔

ایک مرتبہ سانپ بچھو سے حفاظت کے لئے حسب ذیل دستک بتائی:

شلی شل پائی شل دستی شل دم
از اول شب بخسپ تا صبح مجنب
بستم دہن مارو نیش کژدم
درود بر روح نبی گفتم رستم

دستک دے کر سو جائے، صبح تک حفاظت رہے گی۔

ایک مرتبہ فرمایا کے کسی بزرگ نے امام محمد کو خواب میں دیکھا اور ان سے ان کی نزع کی کیفیت دریافت کی۔ فرمایا کہ مجھے تو پتہ بھی نہ چلا، کیونکہ میں اس وقت "رمی جمار" کے مسئلے پر غور کر رہا تھا۔ (یہ بھی خوب ہے کہ موت کا وقت اور شیطان کو کنکریاں مارنے کے مسئلے پر غور و فکر)۔

میں نے دریافت کیا کہ امام محمد کی تو یہ کیفیت اور حضورؒ کو نزع کے وقت تکلیف ہوئی ۔فرمایا کہ حضورؒ تمام مقامات طے کر چکے تھے اور امام محمد درمیان میں تھے ایک دائرہ فرض کرو، تو ایک شخص جس نقطے سے چلا تھا اگر پورا دائرہ طے کر کے اسی نقطے پر پہنچ گیا تو اس کی تمام کیفیات وہی ہوں گی جو بتدی کی ہوتی ہیں اور جو درمیان میں ہو اس کی کیفیات مختلف ہوں گی ۔

فرمایا کہ میں نے ایک مرتبہ خواب دیکھا کہ میرے استاد مولانا معین الدین آگے ہیں اور میں اور مولانا یونس (مولانا کے پرانے شاگرد) ان کے پیچھے چل رہے ہیں ۔ راستہ نہ تھا لیکن چلے تو راستہ بن گیا ۔وہ راستہ سمندر پر جا کر ختم ہوا ۔مولانا نے فرمایا کہ چلو، اور یہ کہہ کر سمندر میں پیر رکھا ۔ہم نے بھی پیروی کی ۔ دیکھا تو دوسرا قدم دوسرے کنارے پر تھا ۔راستہ وہاں بھی نہ تھا، لیکن ایسا معلوم ہوا کہ اوپر سے کسی نے بنا بنایا راستہ زمین پر رکھ دیا ۔اب صرف میں اور مولانا تھے ۔ایک مکان کے قریب پہنچے، باہر جوتے تھے اور اندر سے آوازیں آرہی تھیں ۔مولانا نے مجھے باہر بٹھایا اور خود اندر گئے ۔اندر کسی نے مولانا سے پوچھا کہ وہ لڑکا کہاں ہے ۔مولانا نے جواب دیا کہ حضور وہ باہر ہے، میں اسی لئے اندر آیا ہوں کہ اگر اجازت ہو تو اسے اندر لے آؤں ۔ چنانچہ اجازت ہو گئی ۔اور یہ باتیں میں باہر سے سن رہا تھا ۔مولانا باہر آکر مجھے اندر لے گئے ۔دیکھا کہ وہاں حضرت ابراھیم نخعی تشریف فرما ہیں ۔میں بیٹھا تو حضرت نخعی نے مولانا کو خطاب کر کے فرمایا کہ میں نے اس لڑکے کو اپنی شاگردی میں لے لیا ۔میں نے مولانا کے اشارے پر سلام کیا اور حضرت نخعی کی دست بوسی کی ۔جب یہ خواب میں نے مولانا سے ذکر کیا تو انہوں نے میری پیشانی چومی اور فرمایا کہ تمہارے طفیل میری بھی اس دربار تک رسائی ہوئی ۔میں نے عرض کیا کہ حضور یہ سب آپ ہی کا طفیل ہے ۔

فرمایا کہ گورکھپور کی جامع مسجد میں ہر جمعہ کو وعظ ہوتا تھا ۔میں نے خواب

میں دیکھا کہ یہ اعلان کیا گیا کہ آج بعد نماز جمعہ بہت بڑے عالم وعظ فرمائیں گے ۔ ہم بھی ٹھیرے ۔ دیکھا کہ بہت اونچا منبر لگایا ہے ۔ مولانا جمیل احمد صاحب اس کا پایہ پکڑے کھڑے ہیں اور مجھ سے کہتے ہیں کہ منبر پر چڑھو ۔ چنانچہ میں حکم کے مطابق بالکل اوپر تک چڑھ گیا اور نہایت بہترین وعظ کیا ۔ اس کے بعد مولانا نے مجھے ایک چھتری دی ۔ اس خواب کے بعد مجھے تعین ہو گیا کہ میں اپنی تدریسی زندگی میں عروج پر ضرور پہنچوں گا ۔ راقم الحروف نے عرض کیا کہ واقعتہً اللہ نے آپ کو عروج بخشا کہ قدیم اور جدید دونوں قسم کی درسگاہوں میں اعلیٰ مدارج تک پہنچے (قدیم عربی مدارس میں صدر مدرس رہے اور کراچی یونیورسٹی میں پروفیسر اور ڈین) ۔

فرمایا کہ مولانا معین الدین کے وصال کے بعد خواب دیکھا کہ نہایت عالی شان مکان ہے اور اس کے گرد نہایت خوبصورت باغ ہے ۔ میں باغ میں ہوں کہ ایک کمرے سے مولانا نکل کر آئے ۔ میں نے کہا کہ یہ آپ کا ہے، اسی لئے تو مجھے یہاں یگانگت محسوس ہوئی ۔ مجھے باغ کی سیر کرائی اور رخصت کرتے وقت کمر بند سے کھول کر دو چابیاں دیں ۔ شاہد علی صاحب نے اس خواب کی تعبیر یہ دی کہ دونوں چابیاں علم منقول اور علم معقول ہیں ۔

راقم الحروف کہتا ہے کہ علم معقول میں تو مولانا منتخب الحق صاحب اپنے وقت کے امام تھے ہی، علم منقول میں بھی مولانا کو یہ مقام حاصل تھا کہ تمام منقول علوم کے ساتھ ساتھ بخاری اور ترمذی کا برسوں درس دیا ۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو آخرت میں بھی اپنی رحمتوں سے نوازے اور جنت الفردوس عطا فرمائے، آمین ۔

حضرت مولانا محمود الحسن صاحب

میرے استاد حضرت مولانا محمود الحسن صاحب گیاوی، رحمتہ اللہ علیہ، سرونج کے مدرسہ ریاض المدارس میں پچاس روپے ماہوار پر صدر مدرس مقرر ہوئے تھے۔ باذوق انسان تھے، مٹھائی اور پان کا بہت شوق تھا۔ عمامہ بہت اچھا باندھتے تھے۔ میں نے عمامہ باندھنا ان سے اور ان کے بھائیوں سے ہی سیکھا۔

موصوف کو تقریر کا اچھا سلیقہ تھا۔ ایک مرتبہ ربیع الاول میں سرونج کی جامع مسجد میں میلادالنبی صلی اللہ علیہ وسلم کے موضوع پر جو تقریر کی اس کا مرکزی مضمون مجھے اب تک یاد ہے۔ فرمایا تھا کہ کھلے میدان میں جب کوئی بڑا جلسہ کیا جاتا ہے تو پنڈال بنایا جاتا ہے، فرش اور کرسیاں بچھائی جاتی ہیں، ڈائس تیار کیا جاتا ہے، جلسہ گاہ کو سجایا جاتا ہے، کام کرنے والے کام کرتے ہیں اور منتظمین ان کی نگرانی کرتے رہتے ہیں۔ آخر میں اونچے درجے کے منتظمین آکر معائنہ کرتے ہیں کہ تمام کام اطمینان بخش ہیں یا نہیں۔ اس کے بعد مقررہ تاریخ اور مقررہ وقت پر لوگ جمع ہونا شروع ہوجاتے ہیں اور سب سے آخر میں جلسے کے مہمان خصوصی کو لایا جاتا ہے۔

اس کائنات کے مہمان خصوصی کے ساتھ بھی یہی اہتمام کیا گیا کہ زمین کا فرش بچھایا گیا، آسمان کا پنڈال بنایا گیا، پھر اسے ممکن حد تک آراستہ کیا گیا، مختلف انبیاء علیہم السلام آئے اور مناسب انتظامات کرتے گئے اور مہمان خصوصی سید البشر اشرف الانبیاء خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام انبیاء کے آخر میں مبعوث فرمایا گیا اور آپ کے بعد اس جلسے کو برخاست ہی ہونا ہے۔ جس کی مدت اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی رحمتوں سے نوازے۔

حضرت قاری سید فصیح احمد صاحب

میرے استاد حضرت قاری سید فصیح احمد صاحب مونگری، رحمتہ اللہ علیہ، سرونج کے مدرسہ ریاض المدارس میں پچاس روپے ماہوار پر نائب صدر مدرس بن کر تشریف لائے تھے۔ باذوق اور خوش اخلاق بزرگ تھے، لیکن تدریس اور دین کے معاملات میں ان کے مزاج میں بڑا تشدد تھا۔ کبڈی کھیلتے ہوئے یا شکار یا دوسرے تفریحی مواقع پر وہ طلبہ کے ساتھ اس طرح بے تکلف ہو جاتے تھے کہ استاد اور شاگرد کا فرق مٹ سا جاتا تھا، لیکن تدریس کے وقت بالکل شیر اور بکریوں کی مثال صادق آتی تھی۔ دین کے خلاف ادنیٰ سی بات بھی ان کے لئے ناقابل برداشت تھی اور تہجد کے وقت ذکرِ جہر کی آواز ہم نیچے سنا کرتے تھے (قاری صاحب کی رہائش پہلی منزل پر تھی)۔

میرے اساتذہ کی طویل فہرست میں شیخ الاسلام حضرت مولانا مدنیؒ کے بعد یہی ایک استاد ہیں جو بڑی حد تک اس شعر کا مصداق تھے:

در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق

ہر ہو سنا کے نداند جام و سنداں با ختن

(ایک ہاتھ میں شریعت کا (شیشے کا) جام ہے اور دوسرے میں عشق کی سندان، ہر ہو سناک (بیک وقت) جام اور سندان سے کھیلنا نہیں جانتا)۔ (سندان زمین میں گڑے ہوئے اس لوہے کو کہتے ہیں جس پر رکھ کر لوہار گرم لوہے کو کوٹتا ہے)۔

ان کی تدریس کی یہ کیفیت تھی کہ جب میں یا حکیم محمد صدیق (دو ہی ہم جماعت تھے) عبارت پڑھتے اور اعراب کی کوئی غلطی ہو جاتی تو ہمیں یہ کہہ کر اٹھا دیا کرتے تھے کہ مطالعہ کر کے آؤ۔ دوبارہ غلطی ہوتی تو دوبارہ اٹھا دیتے، اور اگر تیسری بار بھی غلطی ہوتی تو چھڑی کو کام میں لاتے ہوئے غلطی پر متنبہ فرماتے۔ قاری صاحب کی

اس سختی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمیں عربی کی عبارت صحیح پڑھنا آ گئی اور اس کی وجہ سے ہم دونوں دارالعلوم دیوبند میں بھی نیک نام رہے۔

فقہ کی پہلی کتاب "نور الایضاح" شروع ہوئی تو اس وقت ہم دونوں جوانی کی سرحد میں قدم رکھ چکے تھے۔ جب حیض کا بیان آیا تو ہم دونوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی، قاری صاحب نے کتاب بند کی، چاقو نکال کر مجھے دیا کہ کھجور کی دو چھڑیاں کاٹ کر لاؤ۔ (مدرسے کے باغیچے میں کھجور کے متعدد درخت تھے) ایک ایک چھڑی ہم دونوں پر توڑی اور فرمایا کہ میرا اور تمہارا مذاق کا رشتہ تو نہیں، اور اس طرح کی باتیں تو فقہ کی ہر کتاب میں آئیں گی۔ تمہیں دین سیکھنا ہے یا لذت لینا ہے؟

قاری صاحب کی اس تنبیہ نے، اللہ تعالیٰ انہیں اپنی بے پایاں رحمتوں سے نوازے، ہمیشہ کے لئے عبرت دلا دی جس نے مجھے خود اپنی تدریسی زندگی میں بھی بڑا کام دیا۔

قاری صاحب نے طلبہ کی دینی تربیت کس طرح فرمائی اس کا اندازہ اس سے ہو گا کہ ایک مرتبہ مدرسے کی مسجد میں، جس میں مولانا محمود الحسن صاحب امامت فرماتے تھے، عصر کی نماز ہنوز ختم نہ ہوئی تھی کہ قاری صاحب کنگران کی مسجد سے، جس کے وہ امام تھے، عصر کی نماز پڑھ کر مدرسہ آ گئے۔ دیکھا کہ چند طلبہ سلام پھیرے جانے کے بعد اپنی باقی ماندہ رکعات پوری کر رہے ہیں، جن میں راقم الحروف بھی تھا۔ جب ہم باہر نکلے تو ایسے تمام طلبہ کو جمع کیا، کھجور کی چھڑیاں کٹوا کر منگوائیں اور سب کو سزا دی۔ فرمایا کہ نماز سے پندرہ منٹ پہلے مدرسے کی چھٹی ہو جاتی ہے اس عرصہ میں تم کیا کرتے رہے، تمہاری تکبیر تحریمہ کیسے فوت ہوئی؟

ایک مرتبہ جمعہ کے روز میں اور چند طلبہ جُواری ندی پر مچھلیوں کے شکار کے لئے چلے گئے۔ جمعہ کی نماز فوت ہو گئی، شام کو واپس آئے۔ قاری صاحب کو معلوم ہوا تو کھجور کی چھڑیوں سے خوب تواضع کی اور فرمایا کہ جمعہ کا روز بلاشبہ تعطیل کا دن ہے لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ جمعہ کی نماز فوت ہو جائے۔

حیدرآباد آرمی میں ملازمت کے دوران جب میں پہلی بار رخصت پر سروج آیا اور قاری صاحب سے ملنے کے لئے گیا تو اوپر ہی سے کہلوادیا کہ میں کسی اللہ کے نافرمان سے ملنا نہیں چاہتا۔ میں حیران ہو کر واپس آگیا۔ کنگران کی مسجد سے عصر کی نماز پڑھ کر جب قاری صاحب واپس مدرسہ تشریف لا رہے تھے تو میں سامنے آگیا، میں نے سلام کے بعد دریافت کیا کہ آپ نے میری کون سی اللہ کی نافرمانی دیکھی؟ فرمایا کہ مجھے معلوم ہوا تھا کہ فوج میں ملازمت کے بعد تم نے ڈاڑھی کٹالی تھی۔ میں نے عرض کیا کہ میری ڈاڑھی جتنی اس وقت ہے، اس سے کم تو کبھی نہیں ہوئی۔ بس ناراضگی دور ہو گئی۔

یوپی کے ضلع اعظم گڑھ میں "مئوناتھ بھنجن" نام کی ایک بستی ہے۔ اس میں چشتیہ سلسلے کے ایک بزرگ حافظ محمود الحسن صاحب کی رہائش تھی۔ ان کے متعدد خلفا میں سے ایک صاحب تھے مولوی عبدالسمیع صاحب۔ قاری صاحب اور مولوی صاحب (مولانا محمود الحسن صاحب) دونوں انہی عبدالسمیع صاحب سے بیعت تھے۔

قاری صاحب کے نزدیک تصوف کا اصل معیار کیا تھا، اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوگا کہ ایک روز معمول کے مطابق مغرب کے بعد سب لوگ کھانا کھا رہے تھے۔ میں بھی شریک تھا۔ قاری صاحب نے مولوی صاحب سے کھانے کے دوران کہا کہ ہمیں بیعت ہوئے اتنے دن ہو گئے لیکن اب تک کوئی فائدہ محسوس نہیں ہوا۔ مولوی صاحب نے جواب دیا: واہ! فائدہ کیوں محسوس نہیں ہوا۔ قلب میں ذکر اور نور محسوس ہوتا ہے، کیا یہ فائدہ نہیں؟ اس پر قاری صاحب کو جلال آگیا، فرمایا: اچھائیاں پیدا ہونا تو درکنار، جو اخلاقی برائیاں ہمارے اندر موجود تھیں وہ بدستور موجود ہیں، تو قلب کے اس نور اور ذکر کو لے کر کیا انسان چاٹے۔

مولوی عبدالسمیع صاحب کے انتقال کے بعد قاری صاحب کو دادا پیر حافظ محمود الحسن صاحب سے خلافت ملی اور قاری صاحب کے بھی متعدد خلفاء ہوئے جن میں سے ایک حافظ عتیق اللہ خان صاحب مرحوم بھی تھے۔

مدرسہ ریاض المدارس اور بٹو بھیا کے مکان کے درمیان صرف ایک سڑک حائل تھی اور قاری صاحب مدرسے کی پہلی منزل کے جس حصہ میں رہتے تھے اس کے مقابل کے کمرے میں حبیب شاہ کی رہائش تھی ۔ ایک مرتبہ رات کے بارہ بجے کے قریب قاری صاحب نے اپنے مکان سے اتر کر بٹو بھیا کا دروازہ کھٹکھٹایا ۔ بٹو بھیا نکلے تو پوچھا حبیب شاہ کے کمرے میں لے چلو ۔ اوپر گئے تو دروازہ اندر سے بند تھا ۔ جب کھٹکھٹانے پر دروازہ نہ کھلا تو قاری صاحب نے کہا کہ دروازہ توڑ دو ۔ اندر دیکھا تو حبیب شاہ بے ہوش پڑے تھے ۔ قاری صاحب نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا، وہ ہوش میں آگئے ۔ قاری صاحب انہیں لے کر مدرسے میں آئے اور انہیں سمجھایا کہ اس طرح کے عمل کسی ماہر عامل کی اجازت اور اس کی نگرانی کے بغیر نہیں کرنے چاہییں ۔

جب مجھے اس واقعہ کی اطلاع ملی تو میں نے حبیب شاہ سے اصل صورتِ حال دریافت کی ۔ حبیب شاہ نے بتایا کہ میں ایک مقصد سے ایک جلالی عمل کر رہا تھا ۔ حصار میں بیٹھ کر عمل پڑھتا تھا ۔ انتالیس روز تو مختلف مناظر دیکھتے گزر گئے اور میں نے خوف نہ محسوس کیا، لیکن چالیسویں روز جو عمل کا آخری دن تھا، میں نے ایک دیو قامت وجود کو دیکھا جس کے ہاتھوں میں ایک بچہ تھا، اس نے دونوں ٹانگیں پکڑ کر بچے کو چیر دیا اور اس کی آلائش اور خون کے چھینٹے مجھے اپنے اوپر پڑتے ہوئے محسوس ہوئے اور میں بے ہوش ہو گیا ۔ اس کے بعد مجھے اس وقت ہوش آیا جب قاری صاحب نے آکر میرا ہاتھ پکڑا ۔

قاری صاحب کے چھوٹے بھائی مولانا معظم حسین کا بیان ہے کہ مرض الموت میں جب ڈاکٹروں نے خون چڑھانے کا مشورہ دیا تو قاری صاحب نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں کوئی ایسا خون اپنے جسم میں داخل کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا جس کے بارے میں مجھے نہیں معلوم کہ کسی نیک آدمی کا خون ہے یا کسی فاسق و فاجر کا ۔ چنانچہ خون نہ لیا اور جان، جہاں آفریں کے سپرد کر دی، اللہ تعالیٰ ان پر ہزاروں رحمتیں نازل فرمائے ۔ آمین ۔

خواجہ فضل علی صاحب مسکین پوری

اپنے دادا پیر حضرت فضل علی صاحب قریشی مسکین پوری کی زیارت مجھے نصیب نہیں ہوئی، لیکن اپنے بزرگوں سے ان کا ذکر اس کثرت سے سنا ہے کہ "شنیدہ" گویا "دیدہ" کی طرح معلوم ہوتا ہے، اسی لئے ذیل میں ان کے کچھ واقعات ذکر کر رہا ہوں۔

میں اکتوبر ۱۹۷۱ء میں حضرت فضل علی صاحب کے سالانہ عرس میں شرکت کے لئے مسکین پور گیا۔ مقصود صرف یہ دیکھنا تھا کہ اس عرس میں ہوتا کیا ہے۔ وہاں دیکھا کہ قرآن خوانی اور تقریروں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ اس عرس کی تاریخیں بھی موسم اور تعطیلات کی رعایت سے تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔

۳۔ اکتوبر کو ظہر کے بعد تقریر کرتے ہوئے چکوال والے حافظ غلام حبیب صاحب مرحوم نے، جو حضرت فضل علی صاحب کے خلیفہ عبدالمالک صاحب احمد پوری کے خلیفہ تھے، فرمایا کہ ایک مرتبہ رمضان المبارک میں اشراق کے بعد شاہ فضل علی صاحب مسجد میں تشریف فرما تھے۔ حسبِ معمول مسجد میں لوگوں کا مجمع تھا۔ ایک خوبصورت سرخ و سفید مسافر آکر حضرت کے قریب بیٹھ گیا اور کہا کہ میں بھوکا ہوں، کچھ کھانے کے لئے منگوائیے۔ حضرت نے اپنے خادم سے فرمایا کہ گھر سے کھانے کے لئے کچھ لے آئے، کیونکہ یہ مسافر ہیں اور مسافر پر روزہ فرض نہیں۔ کھانا آیا تو مسافر نے کہا کہ حضرت مہمان کی خاطر داری اسلامی شعار ہے۔ میری خاطر آپ بھی کھانے میں شریک ہو جائیں۔ آپ نے فرمایا کہ تمہاری یہ بات میں اس شرط پر مانتا ہوں کہ بعد میں تم بھی میری بات مانو۔ اس نے منظور کر لیا۔ حضرت بسم اللہ کہہ کر اس کے ساتھ کھانے میں شریک ہو گئے۔

حاضرین میں کچھ تو پرانے وابستگان تھے، کچھ بالکل نئے اور کچھ متوسط لوگ، جن کی وابستگی پختہ نہ تھی۔ آخری دونوں گروہ لاحول پڑھتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے مسجد سے نکل گئے کہ کیسا پیر ہے، رمضان کا روزہ توڑ دیا۔ پرانے وابستگان بیٹھے رہے۔ نئے لوگ تو بالکل ہی چلے گئے، متوسط لوگوں میں سے کچھ حضرات مسجد کے باہر کھڑے رہے کہ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔

کھانے سے فارغ ہو کر حضرت نے فرمایا کہ اب میری بات مانو کہ تمہارے گلے میں جو صلیب ہے اسے توڑ ڈالو اور اسلام لے آؤ۔ مسافر نے کہا۔ میری یہ کیفیت ہے کہ اردو مادری زبان کی طرح بولتا ہوں اور قرآن اتنی نفاست سے پڑھتا ہوں کہ کئی بار میں نے امامت کی ہے اور آج تک کوئی شخص تمیز نہیں کر سکا کہ میں مسلمان نہیں ہوں۔ آپ نے کیسے جان لیا کہ میرے گلے میں صلیب چھپی ہوئی ہے اور میں عیسائی ہوں؟ فرمایا: اس بات کو چھوڑو اور وعدے کے مطابق میری بات مان لو۔ وہ شخص اتنا متاثر ہوا کہ اسی وقت اسلام لے آیا۔

یہ دیکھ کر مسجد کے باہر جو لوگ کھڑے تھے اور دیوار کے اوپر سے سر نکال نکال کر دیکھ رہے تھے آہستہ آہستہ مسجد میں واپس آگئے۔ جب سب لوگ جمع ہو گئے تو حضرت نے فرمایا۔ دیکھو بھائی یہ میں بھی جانتا ہوں کہ رمضان کا روزہ اضطرار کے بغیر قصداً توڑ دینے سے گناہ بھی ہوتا ہے اور کفارہ بھی واجب ہوتا ہے۔ اور یہ بھی جانتا ہوں کہ کفارہ غلام آزاد کرنا ہے یا ساٹھ روزے رکھنا یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا۔

غلام میرے پاس نہیں کہ آزاد کر دوں۔ اور میں فقیر آدمی ہوں، بکثرت روزے رکھنے کی عادت ہے اس لئے ساٹھ روزے رکھنا میرے لئے کوئی دشوار نہیں، اور اگر یہ دشوار ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا میرے لئے کیا مشکل ہے جبکہ سیکڑوں آدمی میرے لنگر سے کھانا کھاتے ہیں۔ خدا کی قسم اگر مجھے ہر روز ایسا شکار ملے تو رمضان کا ہر روزہ توڑوں اور ہر روزے کا کفارہ ادا کروں۔

مزید فرمایا کہ جب خواجہ فضل علی قریشی صاحب کے زمانے میں سالانہ جلسہ ہوتا تھا تو جلسے کے بعد عام آدمی واپس ہو جاتے تھے اور حضرت اپنے خلفا اور مخصوص لوگوں کو مزید ایک دو روز کے لئے روک لیا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ خلفاء کی مجلس میں فرمایا کہ میں آپ لوگوں سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں، لیکن خیال ہوتا ہے کہ آپ لوگ یہ نہ سوچیں کہ اب فضل علی بھی ڈینگیں مارنے لگا۔ پھر قبل اس کے کہ اصل بات بیان کرتے۔ فرمایا کہ ایک مرتبہ مجھے ریاحی تکلیف ہوئی۔ شدید تکلیف میں تڑپتا رہا۔ یہاں تک کہ ریح خارج ہوئی تب سکون آیا۔ تو جو شخص اتنا مجبور اور حقیر ہو کہ ذرا سی ہوا اسے تڑپا دے، پھر اس کے خارج ہونے کے بعد اسے سکون آئے، وہ کیا ڈینگیں مارے گا۔ اس کے بعد فرمایا کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مخصوص اصحاب کے ساتھ تشریف لائے اور میری پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر فرمایا: "واہ قریشی واہ، تم نے خوب جماعت تیار کی ہے، آج مجموعی حیثیت سے روئے زمین پر اس سے بہتر کوئی جماعت نہیں۔" اس وقت حضرت کی عمر ستر سال سے تجاوز کر چکی تھی۔

مزید فرمایا کہ جن دانوں پر ختم ہوتا تھا ان میں سے ایک دانہ خراب ہو گیا تو حضرت فضل علی صاحب نے اسے علحدہ کر دیا۔ اس دانے نے فریاد کی کہ مجھ پر اللہ کا نام لیا جاتا تھا، آپ نے مجھے اس سے محروم کر دیا۔ حضرت نے اسے پھر ان دانوں میں شامل کر لیا۔ وہ دانہ آج تک ان دانوں میں موجود ہے۔

مزید فرمایا کہ میلے کپڑے اتار کر لاپروائی سے ادھر ادھر پھینک دینے سے حضرت فضل علی صاحب منع فرماتے تھے۔ فرماتے تھے کہ انہوں نے تو تمہارے جسم کو زینت بخشی اور تم ان کی یوں ناقدری کرتے ہو۔

مزید فرمایا کہ حضرت فضل علی صاحب کی طبیعت میں اس درجہ احتیاط تھا کہ درخت کے نیچے پڑا پھل بھی مالک کی اجازت کے بغیر کھانا پسند نہ کرتے تھے۔ ایک صاحب نے جو عالم تھے، حضرت کی بیری کا ایک بیر جو نیچے پڑا تھا، کھا لیا۔ حضرت اس

وقت مراقبے میں تھے۔ بعد میں حضرت نے دریافت کیا کہ آپ نے میری اجازت کے بغیر بیر کیوں کھایا؟ جواب دیا کہ تبرک سمجھ کر۔ فرمایا کہ پھر تبرک سمجھ کر میری سب چیزیں اجازت کے بغیر لے جاؤ۔

عبدالمالک صاحب مرحوم (بکر والے) حضرت فضل علی صاحب کے خادمِ خاص تھے۔ میں نے بھی ان کی زیارت کی ہے۔ وہ حضرت کی بکریاں چرانے پر مامور تھے۔ بکریاں جس کوٹھری میں بند کی جاتی تھیں، اس پر پھوس کا چھپر تھا۔ ایک مرتبہ دروازے کے قریب، چھپر سے نزدیک بھڑوں نے چھتہ بنالیا، عبدالمالک صاحب نے مشعل بنا کر چھتہ جلانا چاہا تو چھپر نے آگ پکڑ لی اور سارا چھپر جل گیا۔ عبدالمالک صاحب خوف کی وجہ سے روپوش ہوگئے۔ حضرت خاموش رہے۔ اس عرصے میں ایک روز کوئی شخص کھجوریں تقسیم کرنے کے لئے لایا۔ کھجوریں تقسیم ہوئیں تو حضرت نے فرمایا: عبدالمالک کہاں ہے، اس کے حصے کی کھجوریں مجھے دے دو، چنانچہ کھجوریں لے کر چادر کے پلّے میں باندھ لیں۔ دوسرے روز عبدالمالک صاحب سامنے آئے تو حضرت نے فرمایا: ارے عبدالمالک کہاں تھا، دیکھ تیرے حصے کی کھجوریں میں نے پلّے میں باندھ رکھی ہیں۔ چھپر کے بارے میں ایک لفظ بھی زبان پر نہ آیا۔

ایک مرتبہ عبدالمالک صاحب نے خط بنوایا۔ ڈاڑھی کچھ زیادہ کٹ گئی۔ عصر کی نماز سے نکلتے ہوئے حضرت کی نظر عبدالمالک صاحب پر پڑی۔ فرمایا: ارے عبدالمالک میرے پاس تو آ، میری نظریں کمزور ہو گئی ہیں یا تو نے ڈاڑھی چھوٹی کرالی ہے۔ عبدالمالک صاحب قریب آئے تو ناپ کر دیکھا، ڈاڑھی واقعتہً چھوٹی تھی۔ آگ بگولہ ہوگئے اور فرمایا اسی وقت میرے گھر سے نکل جا، لوگ دیکھیں گے تو کہیں گے فضل علی کا خادمِ خاص اور شریعت کی خلاف ورزی کرتا ہے۔

چھپر جل گیا تو کچھ نہ کہا، ڈاڑھی کم ہو گئی تو گھر سے نکال دیا۔

عبدالمالک صاحب بکر والے نے میرے سامنے فرمایا کہ ایک مرتبہ کسی شخص

نے فضل علی قریشی صاحب کو چینی کا ایک نہایت خوبصورت چائے کا سیٹ لا کر دیا۔ اہلیہ صاحبہ نے اسے اوپر تختے پر سجا دیا۔ مرغی چڑھی اور اس میں کی کچھ چیزیں گر کر ٹوٹ گئیں۔ آپ کو اطلاع ہوئی تو نہایت اطمینان سے فرمایا: "خوب شد سامان خود بینی شکست"۔

یہ دراصل زیب النساء کے ایک شعر کا آخری مصرعہ ہے۔ خادمہ نے زیب النساء کو چینی آئینہ کے ٹوٹ جانے کی اطلاع ان الفاظ میں دی "از قضا آئینہ، چینی شکست" اس پر ناراض ہونے کے بجائے زیب النساء نے جواب دیا "خوب شد سامان خود بینی شکست"۔

شاہ زوّار حسین صاحب نے فرمایا کہ مین نے دیو بندی اور بریلوی گروہ کے بارے میں بہت غور کیا۔ میں نے یہ پایا کہ دونوں گروہوں میں اولیاء اللہ گذرے ہیں، لہٰذا ان دونوں میں سے کسی کو برسر باطل کہنا صحیح نہیں۔ پھر فرمایا کہ دونوں گروہوں کا فرق ایک مرتبہ حضرت خواجہ فضل علی کی مجلس میں سمجھ میں آیا۔ ایک مرتبہ خواجہ فضل علی صاحب چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے اور میں پیر دبا رہا تھا۔ بہت لوگ بیٹھے تھے اور ان میں سے بعض پر وجد و حال کی کیفیت طاری تھی، اور حضرت کی مجلس میں یہی ہوتا تھا کہ وہ گفتگو فرما رہے ہیں اور لوگوں پر وجد و حال کی کیفیت طاری ہے، وہ سفر میں چل رہے ہیں اور لوگ وجد و حال میں ہیں۔ اسی لئے مسکین پور کے اطراف میں لوگوں میں آپ جذبہ والا سائیں کے نام سے مشہور تھے۔ بہرحال میں نے دو آدمیوں کو دیکھا کہ ان میں سے ایک جوان ہے دوسرا بوڑھا۔ دونوں فاصلے پر بیٹھے تھے۔ وقفہ وقفہ سے ایک اٹھ کر دوسرے کے پاس جاتا اور زور سے اس کی پیٹھ پر مکہ مار کر اپنی جگہ آکر بیٹھ جاتا۔ پھر دوسرا یہی کرتا تھا۔ اسی مجلس میں دوسرے دو آدمیوں کو دیکھا کہ دونوں گلے میں ہاتھ ڈالے محبت میں گڈمڈ اور لوٹ پوٹ ہوئے جا رہے تھے۔ میں نے بعد میں حضرت خواجہ فضل علی سے اس کی بابت دریافت کیا تو فرمایا کہ جو

گڈمڈ ہو رہے تھے ان دونوں پر ایک ہی نسبت پڑ رہی تھی اور اتحادِ نسبت کا اثر جسمانی اتحاد کی صورت میں ظاہر ہو رہا تھا۔ اور جو ایک دوسرے کو مار رہے تھے ان پر مختلف نسبتیں پڑ رہی تھیں، ایک پر نسبتِ رسالت پڑ رہی تھی، دوسرے پر نسبتِ توحید، اور یہ دونوں نسبتیں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

جس پر نسبتِ توحید پڑ رہی تھی وہ یہ سوچ رہا تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر غیر اللہ کی طرف کیوں جا رہا ہے، اور جس پر نسبتِ رسالت پڑ رہی تھی وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ تو ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے ہی سے ملا ہے، یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر براہِ راست کیسے اللہ کی طرف جا رہا ہے۔

حضرت شاہ زوّار حسین صاحب نے فرمایا کہ اس واقعہ سے میرے ذہن نے یہ کام کیا کہ بریلویوں پر نسبتِ رسالت کا غلبہ ہے اور دیوبندیوں پر نسبتِ توحید کا۔ دیوبندیوں کا اصل مطمح نظر توحید کی حفاظت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کو اتنا اونچا نہ اٹھایا جائے کہ توحید متاثر ہو، اور بریلوی حضرات پر نسبتِ رسالت کا غلبہ ہے کہ رسول کو نیچے نہ گرنے دیا جائے کہ وہ عوام کی سطح پر آجائیں، بلکہ رسول کو دوسروں سے بلند کیا جائے۔ ان کی نظر اس پر نہیں کہ بلند کرنے میں کہیں توحید متاثر نہ ہو جائے۔ یہ واقعہ میں نے "مقاماتِ زواریہ" میں بھی لکھا ہے یہاں اس لئے اعادہ کیا کہ حضرت فضل علی صاحب کے جو واقعات میرے علم میں ہیں وہ یک جا ہو جائیں۔

حضرت شاہ زوّار حسین صاحب نے بیان کیا کہ ایک مرتبہ حضرت فضل علی صاحب مسکین پور سے تبلیغی دورے پر نکلے۔ ایک روز فرمایا کہ کئی روز ہو گئے گھر والوں کی خیریت نہیں معلوم ہوئی۔ حاضرین میں سے ایک مجذوب قسم کے مرید نے کہا کہ حضرت آپ اجازت دیں تو ابھی تار کر دوں، کل تک خیریت معلوم ہو جائے گی فرمایا: اچھا کر دو، لیکن اگر کل تک خیریت معلوم نہ ہوئی تو تمہاری خیر نہیں۔ اس نے

اسی وقت انگلیوں سے اشارے کرتے ہوئے ٹنن ٹنن کیا اور کہا کہ فلانے حضرت صاحب کے گھر کی خیریت لے کر کل فلاں گاؤں پہنچو۔ دوسرے دن آدمی خیریت لے کر پہنچ گیا۔ حضرت نے اس سے دریافت کیا کہ تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ میں خیریت معلوم کرنا چاہتا ہوں؟ اس نے جواب دیا کہ حضرت میں ٹٹی کے لئے گاؤں سے باہر گیا ہوا تھا۔ وہاں مجھے ٹنن ٹنن کی آواز سنائی دی، اور کسی نے میرا نام لے کر مجھ سے کہا کہ حضرت کے گھر سے خیریت لے کر کل فلاں گاؤں میں پہنچو۔

شاہ زوّار حسین نے فرمایا کہ مولانا عبدالمالک صاحب (لسونڈہ والے) نے حضرت فضل علی صاحب کی دعوت کی اور مولانا حسین احمد صاحب مدنی کو بھی مدعو کیا مولانا مدنی نے فضل علی صاحب کو اپنے یہاں دیو بند مدعو کیا، چنانچہ دیو بند تشریف لے گئے۔ مولانا مدنی نے فضل علی صاحب کو طلبہ سے بھی متعارف کرایا اور تعریف کی۔

مزید فرمایا کہ صوفی اللہ نواز صاحب اور کچھ دیگر حضرات مولانا تھانوی کی خدمت میں پہنچے تو حضرت تھانوی نے دورانِ گفتگو فرمایا کہ ہمارا کیا تقویٰ، تقویٰ اگر دیکھنا ہے تو اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں کہ ان کے یہاں حقیقۃً تقویٰ ملتا ہے۔ اشارہ فضل علی صاحب کی طرف تھا۔ اگرچہ صراحۃً اُن کا نام نہیں لیا۔

حضرت صوفی محمد احمد صاحب نے بیان کیا کہ خواجہ فضل علی صاحب کاشتکاری کرتے تھے، ہل بھی خود ہی چلاتے تھے۔ ایک مرتبہ ہل چلا رہے تھے اور کچھ مرید درخت کے سائے میں بیٹھے تھے۔ ایک مرید سے حضرت کا سخت گرمی میں ہل چلانا برداشت نہ ہو سکا، عرض کیا کہ حضرت آپ تھوڑی دیر سایہ میں آرام کر لیں، ہل میں چلائے لیتا ہوں۔ جب اس نے زیادہ اصرار کیا تو اس کی بات مان لی۔ مرید نے جونہی ہل سے ہاتھ لگایا بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ حضرت نے لوگوں سے کہا کہ اسے اٹھا کر سایہ میں لٹا دو۔ فرمایا کہ میں ہل چلاتے ہوئے روزانہ سوا لاکھ مرتبہ ذکر کرتا ہوں۔ اس ذکر

کے ہل میں جو اثرات ہیں وہ انہیں برداشت نہیں کر سکا۔

حضرت صوفی محمد احمد صاحب نے فرمایا کہ ایک شخص ہمیشہ فضل علی صاحب کے پیچھے پیچھے نہایت ادب سے چلا کرتا تھا۔ ایک روز حضرت نے کھانے پر اپنے ساتھ بیٹھا لیا تو حضرت کے آگے کا سالن بھی صاف کر گیا۔ حضرت نے فرمایا: چلنے میں پیچھے پیچھے اور کھانے میں آگے آگے ۔ سنت یہ ہے کہ آدمی اپنے سامنے سے کھائے اور دوسروں کا خیال رکھے ۔ فرمایا کہ حضرت کو اتباعِ سنت کا بڑا خیال رہتا تھا۔

مولانا عبدالغفور صاحب عباسی مدنی

مجھ سے غالباً حضرت صوفی محمد احمد صاحب نے بیان فرمایا کہ حضرت مولانا عبدالغفور صاحب اور ان کے چھوٹے بھائی مولانا محمد عمر صاحب دلی میں مفتی کفایت اللہ صاحب کے مدرسہ امینیہ میں مدرس تھے۔ ایک مرتبہ حضرت محمد سعید صاحب تبلیغی دورے پر دلی گئے۔ ایک روز مدرسہ امینیہ کا ایک طالب علم ان کے حلقے میں پہنچ گیا۔ حضرت محمد سعید کی توجہ کا اس پر اتنا اثر ہوا کہ رونے، چلانے اور تڑپنے لگا۔ یہ بات مولوی محمد عمر صاحب کو معلوم ہوئی تو چراغ پا ہو گئے اور محمد سعید صاحب کے پاس پہنچ کر ان سے غصے کے عالم میں کہا کہ ایک سیدھے سادے طالب علم پر نہ معلوم کیا کر دیا، مجھ پر توجہ ڈالو تو میں جانوں۔ محمد سعید صاحب نے جواب دیا کہ میرا تو کوئی تصرف نہیں، جو کچھ ہوتا ہے اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ آپ چاہیں تو کسی روز حلقے میں تشریف لے آئیں۔ چنانچہ وہ جمعرات کو حلقے میں پہنچ گئے۔ حضرت نے توجہ دی تو ان کی حالت ان کے شاگرد سے بھی بدتر ہو گئی۔ حلقہ ختم ہونے کے بعد بھی مجنونانہ حرکات کرتے رہے۔ محمد سعید صاحب نے فرمایا کہ ان کو کمرے میں بند کر دو۔ چنانچہ بند کر دیئے گئے اور بڑبڑاتے رہے۔ عشاء کی نماز کے وقت محمد سعید صاحب نے کمرہ کھلوایا۔ انہوں نے پورے ہوش کے ساتھ وضو کیا، نماز پڑھی اور نماز کے بعد ان پر پھر وہی کیفیت طاری ہو گئی، چنانچہ پھر بند کر دیا گیا اور رات بھر ان پر کیفیات طاری رہیں۔ فجر کے وقت پھر کھولا گیا۔ انہوں نے سکون سے نماز پڑھی اور پھر کیفیات میں غرق ہو گئے۔ چنانچہ پھر بند کر دیا گیا۔ جمعہ کی نماز کے لئے کھولا گیا تو نماز کے فوراً بعد منبر پر کھڑے ہو کر ہاتھ پھیلا کر کہنے لگے کہ لوگو یہ رسول کا ہاتھ ہے اس سے مصافحہ کرو۔ نمازیوں میں سے ایک درویش نے ان سے مصافحہ کیا اور محمد سعید صاحب سے مخاطب ہو کر کہا کہ

آپ نے یہ دولت اتنی ارزاں کر دی ۔ درویش کے مصافحہ کے بعد ان کی کیفیات ختم ہو گئیں ۔

یہ حالات ان کے بڑے بھائی مولانا عبد الغفور صاحب کو معلوم ہوئے تو وہ محمد سعید صاحب کی خدمت میں پہنچے، ان سے استفادہ کیا اور کچھ دن بعد کہا کہ آپ مجھے بیعت کر لیجئے ۔ محمد سعید صاحب نے انکار کیا اور فرمایا کہ آپ عالم ہیں اور میں جاہل، پھر میرے پیر بھی حیات ہیں، ان کے ہوتے ہوئے میں آپ جیسے عالم کو بیعت نہیں کر سکتا، چاہیں تو میرے پیر سے بیعت کر لیں ۔ چنانچہ ان کو لے کر اپنے پیر حضرت خواجہ فضل علی صاحب کی خدمت میں گئے اور مولانا عبد الغفور صاحب نے ان سے بیعت کر لی ۔

حضرت مولانا عبد الغفور صاحب رحمتہ اللہ علیہ کو اپنے پیر سے بہت محبت تھی ۔ حضرت شاہ زوّار حسین صاحب نے بیان کیا کہ حضرت قریشی صاحب مرض الموت میں چارپائی پر لیٹے زندگی کی آخری سانسیں لے رہے تھے ۔ سر ایک جانب ڈھلکا ہوا تھا اور منہ سے رال بہہ رہی تھی ۔ مولانا عباسی سر کے قریب چارپائی کے نیچے بیٹھے تھے اور رال کو اپنے چلو میں لے لے کر چاٹتے جاتے تھے ۔

محبت کی اس معراج کی جھلکیاں ہمیں صحابہء کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی زندگیوں میں بھی ملتی ہیں ۔ صحابہء کرام، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کا پانی اور لعاب دہن زمین پر نہ گرنے دیتے تھے، اپنے ہاتھوں میں لے کر چہروں اور جسموں پر مل لیا کرتے تھے ۔

ایک مرتبہ ابو طیبہ حجام نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فصد کھولی ۔ حضور نے ان سے فرمایا کہ اس خون کو لے جا کر کسی جگہ دفن کر دو ۔ انہوں نے زمین میں دفن کرنے کے بجائے اسے اپنے پیٹ میں دفن کر لیا ۔

ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا فصد کا خون حضرت عبداللہ بن

زبیر کو کہیں دفن کر دینے کے لئے دیا اور انہوں نے دفن کرنے کے بجائے اسے پی لیا۔

سردیوں کے زمانے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پیشاب کے لئے ایک پیالہ چارپائی کے نیچے رکھ لیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ کی باندی (رضی اللہ عنہا) نے وہ پیشاب پی لیا۔

عام طبیعت اس طرح کے واقعات کے تصور ہی سے تنفر کرتی ہے، لیکن محبت کی دنیا ہوش کی دنیا سے مختلف ہوا کرتی ہے۔

غالباً ۱۹۶۲ء میں جب مولانا عبدالغفور صاحب کراچی تشریف لائے تو سبیل والی مسجد میں عشاء کے بعد ایک جلسہ منعقد ہوا۔ حاضرین کی کثرت تھی، جن میں سے بہت سے حضرات بیعت بھی ہوئے۔ اس جلسے میں تقریر کرتے ہوئے حضرت نے فرمایا کہ مرید کے درجات کی بلندی میں اوراد و اشغال کا روپے میں ایک آنہ اثر ہوتا ہے اور پندرہ آنہ اثر شیخ کی توجہ کا ہوتا ہے۔

حضرت کی یہ بات مجھ پر گراں گذری اور خیال یہ آیا کہ لوگ اپنی پیری چمکانے کے لئے اس طرح کی باتیں کرتے ہیں۔

گھر آکر جب سونے کے لئے لیٹا تو ذہن اسی بدگمانی کی گرفت میں تھا۔ دفعتہً خیال آیا کہ بچے کی نشو و نما میں دو عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ ایک ماں کی محبت اور اس کی توجہات، اور یہی اصل عامل ہے، دوسرے بچے کی مادی ضروریات۔ اگر بچہ ماں کی محبت اور اس کی توجہات کا مرکز نہ رہے اور ماں اس سے غفلت برتنے لگے، نہ وقت پر دودھ پلائے، نہ ضرورت کے وقت اس کے کپڑے تبدیل کرے، نہ اس کی سردی گرمی کا خیال رکھے اور نہ اس کی تکلیف پر اپنی راتوں کی نیند حرام کرے، تو کیا بچہ صحیح طور پر نشو و نما پا سکتا ہے؟ پس بچہ کے پروان چڑھنے میں اس کی غذا اور ماں کی توجہات، کے درمیان ایک اور پندرہ ہی کی نسبت تو ہے۔ پھر حضرت نے اگر پیر اور مرید کی نسبت یہ بات فرمائی تو کیا غلط ہے۔

حضرت مولانا عبدالغفور کے کراچی کے اس سفر کے دوران میرے پیر بھائی حاجی محمد اعلیٰ صاحب ایک مصیبت میں گرفتار تھے۔ ان کی اہلیہ مالیخولیا کی مریض تھیں۔ جب دورہ پڑتا تو کہتیں: میں مرنا چاہتی ہوں، مجھے زہر لادو۔ حاجی صاحب کہتے: تمہیں زہر کھانا ہے تو کسی سے بھی منگوالو، مجھے کیوں گناہ میں شریک کرتی ہو۔

ایک مرتبہ حاجی صاحب صبح دس بجے کے قریب کسی ضرورت سے باہر نکلے اور جب لوٹے تو دیکھا کہ ان کی اہلیہ ذبح کی ہوئی پڑی ہیں۔ پولیس کو اطلاع کی اور مقدمہ درج کر کے تفتیش شروع کر دی گئی۔ اس دوران حاجی صاحب کے لئے، جو ہمیشہ سے اعصابی ضعف کا شکار ہیں، یہ اندیشہ مسلسل سوہان روح بنا رہا کہ پولیس قتل کے الزام میں کہیں انہیں نہ گرفتار کر لے۔

ایک روز میں، مولانا عبدالغفور صاحب، شاہ زوّار حسین صاحب، حاجی محمد اعلیٰ صاحب اور شاید ایک دو صاحبان اور بیٹھے ہوئے تھے۔ حاجی صاحب نے حضرت مولانا عبدالغفور صاحب سے اس مصیبت کا ذکر کر کے دعا کی درخواست کی۔ حضرت تھوڑی دیر خاموش رہے۔ پھر فرمایا آپ سونے کے سوا ہر وقت، خواہ وضو ہو یا نہ ہو یہ پڑھتے رہا کریں۔ **"یٰس والقرآن شر دفع مشکل آسان"** انشاء اللہ خیر ہو گی۔ حاجی صاحب نے اسے اپنا ورد بنا لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حاجی صاحب کی عزت محفوظ رہی اور مقدمہ داخل دفتر کر دیا گیا۔

حاجی صاحب سے اس عمل کی اجازت میں نے بھی لے لی ہے اور میں اس کتاب کے ہر قاری کو جو کسی ناکردہ گناہ مصیبت میں مبتلا ہو اس کی اجازت دیتا ہوں۔

حضرت شاہ زوّار حسین صاحبؒ

حضرت شاہ زوّار حسین صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے مفصل حالات ادارہ، مجددیہ کی شائع کردہ کتاب "مقاماتِ زواریہ" میں موجود ہیں۔ اس کتاب میں "وفات حسرت آیات"، "ملفوظات"، "حضرت شاہ صاحب کی فقہی بصیرت"، "کشف و کرامات" کے عنوانات سے ۶۰ صفحات میرے لکھے ہوئے ہیں۔ حضرت رحمتہ اللہ علیہ سے بیعت کا حال میں اپنی کتاب "حیاتِ بقا" میں لکھ چکا ہوں۔

ان سطروں کی تحریر کے وقت بعض مزید واقعات یاد آرہے ہیں:

ریاضت و مجاہدہ

سلسلے کے اسباق میں حضرت شاہ صاحب کے مجاہدہ کا حال ہم حضرت صوفی محمد احمد صاحب مرحوم کی زبانی سنا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت شاہ صاحب نے مجھ سے خود فرمایا کہ بسا اوقات ایسا ہوتا تھا کہ میں اپنے وطن میں آبادی کے کنارے پر واقع ایک مسجد میں چلا جاتا تھا اور عشاء کے بعد سے فجر تک مراقبے میں مشغول رہتا تھا۔

اخفائے حال

ایک مرتبہ میں حضرت کے پاس خیرپور ٹامے والی گیا اور وہاں ایک ہفتہ قیام کیا۔ دو روز قیام کے لئے حاجی عبدالغفار صاحب بھی آگئے۔ حاجی عبدالغفار صاحب نے مجھ سے کہا کہ حضرت شاہ صاحب کی کرامت یہ ہے کہ ان کے کپڑے کبھی میلے نہیں ہوتے۔ میں خاموش ہو گیا۔ حاجی صاحب کے چلے جانے کے بعد ایک روز جبکہ میں اور حضرت شاہ صاحب عصر کے بعد تفریح کے لئے آبادی سے باہر نکلے ہوئے تھے، میں نے کہا کہ حاجی عبدالغفار صاحب آپ کی یہ کرامت بیان کر رہے تھے کہ آپ کے کپڑے کبھی میلے نہیں ہوتے۔ اس پر مسکرائے اور فرمایا کہ میری اس کرامت کا شبہ میرے گھر

والوں کو بھی ہوتا ہے۔

فرمایا: ایک مرتبہ میں اور میری اہلیہ بیٹھے تھے اور سامنے بچی کپڑے دھو رہی تھی، بچی نے کپڑے دھوتے ہوئے کہا کہ اماں جی! اباجی کے کپڑے تو کبھی میلے ہوتے ہی نہیں۔ میری اہلیہ نے یہ کہہ کر میری اس کرامت کا بھانڈا پھوڑ دیا کہ کپڑے پہن کر یہ کرتے کیا ہیں، بیٹھے ہی تو رہتے ہیں۔ ہم تو جب جانیں کہ چولھے ہانڈی کا کام کریں اور پھر بھی کپڑے میلے نہ ہوں۔

میں نے عرض کیا کہ اچھا اگر یہ کرامت نہیں تو کیا ہے کہ ہم ایک بات دریافت کرنے کا ارادہ لے کر آپ کے پاس پہنچتے ہیں اور آپ ہمارے اظہار کے بغیر باتوں باتوں میں اس کا جواب دے دیتے ہیں۔ اس کا خود میں نے بارہا تجربہ کیا ہے۔

فرمایا: اللہ جانتا ہے کہ مجھے تو نہیں معلوم ہوتا کہ کس کے دل میں کیا ہے، اب اگر اللہ تعالیٰ کسی کے دل کی بات کا جواب میری زبان سے جاری فرما دیتا ہے تو یہ اللہ کا کرم ہے۔

پیر کامل کے حکم کی تعمیل

ایک مرتبہ میں نے خیرپور ہی میں تفریح کرتے ہوئے دریافت کیا کہ اس کا کیا مطلب ہے:

بہ مے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نہ بود زراہ و رسم منزلہا
(اگر کامل پیر حکم دے تو جانماز کو شراب میں رنگ لو
اس لئے کہ سالک منزل کے راہ ورسم سے بے خبر نہیں ہوتا)

فرمایا کہ پیر، بشرطیکہ کامل ہو، اگر مرید کو کسی ایسی بات کا حکم دے جس کی ظاہری صورت شریعت کے خلاف ہے تو بھی اس کے حکم کی تعمیل کرنی چاہئے، کیونکہ کامل پیر، جو شریعت کی اتباع کے بغیر کامل بن ہی نہیں سکتا، جب وہ دانستہ کسی خلاف

شرع بات کا حکم دے رہا ہو تو اس میں یقیناً کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ اور اس طرح کا حکم پیر کامل "مراد" کو دیتا ہے (وہ جسے اللہ خود اپنی طرف کھینچ رہا ہو)، "مرید" کو نہیں دیتا (جو اللہ تک پہنچنے کے لئے اپنی طرف سے جدوجہد کرتا رہتا ہے) اور پیر کامل جانتا ہے کہ "مراد" کون ہے اور "مرید" کون۔

اس کے بعد حضرت نے حسبِ ذیل دو قصے سنائے:

ایک مرید نے پیر سے درخواست کی کہ اللہ تعالیٰ کو خواب میں دیکھنے کا کوئی عمل بتا دیجئے۔ پیر نے کہا کہ آج عشاء کی نماز پڑھے بغیر سو جانا۔ مرید عشاء کے وقت بڑے تذبذب کا شکار رہا۔ بالآخر اس نے یہ فیصلہ کرکے کہ عشاء کی نماز تو اللہ کی طرف سے فرض ہے، یہ کیسے چھوڑ دوں، فرض ادا کر لئے اور سنت اور وتر چھوڑ کر سو رہا۔ خواب میں دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں: میں نے کیا قصور کیا تھا کہ تم نے میری سنتیں چھوڑ دیں۔ گھبرا کر اٹھا اور سنت اور وتر ادا کئے۔

صبح پیر کے دریافت کرنے پر واقعہ بتایا۔ پیر نے کہا: خدا کی قسم اگر تو فرض پڑھے بغیر سو جاتا تو اللہ تعالیٰ بھی تجھ سے فرماتا کہ اٹھ اور نماز پڑھ۔

فرمایا کہ پیر جانتا تھا کہ یہ "مراد" ہے، اس لئے یہ نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ اس کی عشاء فوت کرا دے۔

دوسرا واقعہ یہ بیان کیا کہ ایک پیر نے مرید کو پیسے دیئے اور کہا کہ فلاں رنڈی کے کوٹھے پر چلا جا، جو اس شہر میں نئی نئی آئی ہے۔ مرید چلا تو گیا، لیکن کوٹھے پر پہنچ کر اس نے رنڈی سے کہا کہ مجھے اجازت دو کہ دو رکعت نماز پڑھ لوں۔ چنانچہ نیت باندھی تو صبح کر دی اور رنڈی کو پیسے دے کر واپس آگیا۔ پیر کے دریافت کرنے پر اس نے واقعہ بتا دیا۔ پیر نے ملامت کی اور کہا میں نے تجھے وہاں اس لئے بھیجا تھا! پھر مزید پیسے دے کر کہا کہ آج پھر اس کے پاس جانا۔ مرید پہنچا اور پھر اس نے اجازت لے کر دو رکعت میں صبح کر دی۔ صبح پیر نے پھر سخت ملامت کی اور مزید پیسے دے کر تیسری بار

بھیجا اور جب نماز شروع کرنی چاہی تو رنڈی نے کہا کہ نماز کے لیے تو مسجد ہوتی ہے،
رنڈی کا کوٹھا تو نماز کی جگہ نہیں ۔اس طرح باتوں کی ابتدا ہوئی تو رنڈی نے بتایا کہ
وہ فلاں جگہ کی رہنے والی ہے ۔اس کے ماں باپ فسادات میں مارے گئے (ماں باپ
کے نام بھی بتائے) اور پھر ہم بھائی بہن بچھڑ گئے (اپنا اور بھائیوں کے نام بھی بتائے) اور
میں جس کے پلّے پڑی اس نے مجھے اس راہ پر لگا دیا ۔ یہ سن کر وہ شخص روتے ہوئے
رنڈی سے لپٹ پڑا ۔ دونوں بھائی بہن تھے ۔اور پھر اس نے اپنی بہن کو اس گندگی سے
نجات دلائی ۔

حضرت قبلہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب

میں جب حضرت شاہ زوّار حسین صاحبؒ سے بیعت ہوا، اس وقت حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب مدظلہ العالی کو خلافت ملے کافی عرصہ گزر چکا تھا۔ اس لئے اسی وقت سے میں موصوف کو اپنے بزرگوں میں سے شمار کرتا ہوں۔ موصوف کا قرب اور ان کی شفقتیں مجھے اس وقت میسر آئیں جب سندھ یونیورسٹی کے شعبہ، اسلامک کلچر میں میرا تقرر ہوا، جہاں ڈاکٹر صاحب قبلہ شعبہ، اردو کے پروفیسر اور صدر تھے۔ سندھ یونیورسٹی میں صرف ایک سال کی ملازمت کے بعد چونکہ میں کراچی یونیورسٹی منتقل ہو گیا اس لئے موصوف کا ظاہری قرب بعد میں تبدیل ہو گیا۔ قلبی تعلق بہرحال باقی رہا اور مجھ ناکارہ پر موصوف کی شفقتوں میں امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اضافہ ہی ہوتا گیا۔

علم باطن کے بغیر صرف کامل علم ظاہر ہو یا علم ظاہر کے بغیر کامل علمِ باطن، یا علم ظاہر و باطن کے کمال کے بغیر صرف انتہاء درجے کا عجز و انکسار اور حسنِ اخلاق، ان میں سے ہر چیز، مراتب کے اختلاف کے مطابق، لوگوں کو اپنا گرویدہ بنانے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ اور جب یہ تینوں عناصر کسی ایک شخصیت میں جمع ہو جائیں تو اس کے ساتھ لوگوں کی گرویدگی کا کیا عالم ہونا چاہئے، یہ محتاج بیان نہیں۔ سہ آتشہ کی تاثیر سے عملی طور سے نہ سہی کم از کم علمی طور سے کون ناواقف ہے!

قبلہ ڈاکٹر صاحب مدظلہ علم ظاہر کے اعتبار سے ایم۔اے، ایل۔ایل بی، پی ایچ۔ڈی، ڈی۔لٹ ہونے کے ساتھ ساتھ یونیورسٹی کے پروفیسر اور صدر شعبہ رہے۔ تدریس کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رہا اور ضعیفی کے باوجود یہ سلسلہ اب تک اس طرح جاری ہے کہ کوئی سال مشکل ہی ایسا گذرتا ہے جب آپ کی

ایک دو کتابیں منظرِ عام پر نہ آجاتی ہوں ۔ بے شمار طلبہ کو پی ایچ ۔ ڈی بھی کرایا۔

علم باطن کے اعتبار سے سامنے کی بات یہ ہے کہ نقشبندی سلسلے کے ایک کامل بزرگ حضرت شاہ زوار حسین صاحبؒ سے انہیں خلافت ملی اور اب مراتب سلوک میں ان کا کیا مقام ہے اس کا صحیح علم تو انہیں ہے یا اللہ عزوجل کو، تاہم مجھے مختلف شواہد کی بنا پر یقین ہے کہ علم باطن میں ان کا مرتبہ علم ظاہر کے ڈی ۔ لٹ سے کم نہیں ۔

حسن اخلاق کے ساتھ ساتھ ان کے عجز و انکسار کا یہ عالم ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں اس کی نظیر نہیں دیکھی ۔ جس سے بھی ملتے ہیں اس کے سامنے گویا بچھ سے جاتے ہیں ۔

یہ پُر فتن زمانہ اور ایسی جامع شخصیت ! " **ذلک فضل الله یوتیه من یشاء** " (یہ اللہ کا فضل ہے، وہ جسے چاہے اس سے نوازے) ۔

ڈاکٹر صاحب قبلہ نے اپنی کتاب " تاریخِ اسلاف " میں زیادہ تر اشاراتی انداز میں اپنے جو حالات تحریر فرمائے ہیں وہ بھی اربابِ بصیرت کے لئے ان کے بلند مقام کو سمجھنے کے لئے کافی ہیں ۔

یہ میری کم نصیبی کہ ڈاکٹر صاحب مدظلہ کی صحبت سے فیض یاب ہونے کے لئے مجھے کم عرصہ ملا اور اسی لئے موصوف کے تفصیلی حالات میرے سامنے نہیں آئے۔ جو حالات اور واقعات میرے علم و مشاہدے میں آئے اور حافظے میں محفوظ رہے وہ یہ ہیں :

۱۔ اپنی کتاب " حیاتِ بقا " میں، میں نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ میں نے جب ۱۹۷۰ء میں حج کا ارادہ کیا اور قرعہ میں نام نہ آنے کے ساتھ ساتھ ہر طرف سے مایوس ہو گیا تو حضرت ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں پہنچا۔ موصوف نے فرمایا " ارے مفتی صاحب آپ حج کی تیاری کیجئے، میں نے آپ کو عرفات کے میدان میں دیکھا ہے ۔ " اور واقعۃً اللہ

تعالیٰ نے مجھے اسی سال حج نصیب فرمایا۔

ایسے وقت میں جب کہ اس سال عرفات کے میدان میں اللہ عزوجل کا دربار سجا بھی نہیں، کسی کو عرفات کے میدان میں دیکھ لینا، اس کی تاویل اس کے سوا اور کیا کی جا سکتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب قبلہ کی رسائی عالم مثال تک بھی ہے۔

۲۔ جن دنوں حاجی محمد اعلیٰ صاحب کی اہلیہ کا قتل ہوا (جس کی تفصیل "مولانا عبدالغفور عباسی" کے ذکر میں گذر چکی ہے) ڈاکٹر صاحب ان دنوں حیدرآباد سے کراچی تشریف لائے۔ حاجی صاحب کے ساتھ وہ ان کی اہلیہ کے قبر پر گئے۔ مراقبے میں ان سے دریافت کیا تو انھوں نے بتایا کہ میں نے ایک عورت کو اپنا زیور دیا تھا کہ کسی مرد سے مجھے قتل کرا دے، چنانچہ ایک بھنگی آیا اور اس نے مجھے ذبح کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے دریافت فرمایا: وہ کون سی عورت اور کون سا بھنگی تھا، ان کے نام کیا ہیں؟ اس پر وہ خاموش ہو گئیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے حاجی صاحب کے والد کی قبر پر مراقبہ کیا۔ انھوں نے اپنی بہو پر بہت غصے کا اظہار فرمایا اور کہا کہ اس کمبخت نے میرے بیٹے کو مصیبت میں مبتلا کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ان سے قاتل کا نام دریافت کیا تو خاموش ہو گئے۔

۳۔ ۱۹۹۴ء میں جب کہ میں مکہ مکرمہ میں تھا، ایک گرامی نامہ ارسال فرمایا کہ میں نے ایک سال حج کے موقع پر منیٰ کی مسجد میں حضرت آدم علیہ السلام کا مزار دیکھا، اور اصحاب کہف کو دیکھا کہ وہ مختلف خدمتوں پر مامور ہیں اور جب کسی خدمت سے فارغ ہوتے ہیں، آکر حضرت آدمؑ کی قبر کا طواف کرتے ہیں اور پھر دوسری خدمت بجا لانے کے لئے چلے جاتے ہیں۔ میں نے مسجد خیف میں حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسماعیلؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ وغیرہ اور آخر میں خاتم الانبیاءؐ کو بھی ایک تخت پر تشریف لاتے ہوئے دیکھا۔ یہ سب حضرات حج کے لئے تشریف لائے تھے۔ علیٰ نبینا وعلیہم الصلوات والتسلیمات۔

اس کے بعد مجھے تحریر فرمایا کہ تم اس کی تحقیق کرو کہ حضرت آدم علیہ السلام کی قبر کہاں ہے۔

میں نے کچھ کتابیں دیکھیں اور جواب دیا کہ حضرت آدمؑ کی قبر سری لنکا، جبل ابو قبیس (مکہ) یا ارضِ فلسطین میں بتائی جاتی ہے۔ مسجد خیف میں قبر ہونے کا ثبوت نہیں ملا۔

ڈاکٹر صاحب نے دوبارہ تحریر فرمایا کہ میں نے دوسرے سال بھی حضرت آدم علیہ السلام کی قبر مسجد خیف ہی میں دیکھی اور میں نے حضرت آدم علیہ السلام سے دریافت کیا کہ گذشتہ سال میں نے جن حضرات کو دیکھا تھا، اس سال نظر نہیں آرہے آپؑ نے جواب دیا کہ بیٹے اس سال تم دیر میں آئے ہو، سب لوگ آکر چلے گئے۔

اس لئے مزید تحقیق کرو، شاید کوئی ثبوت مل جائے۔

میں نے مزید کتابیں دیکھیں اور فاکھی نے مکہ کی جو تاریخ لکھی ہے اس میں ایسی روایات مل گئیں جن سے حضرت آدمؑ کی قبر کا مسجد خیف میں ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

۴۔ سندھ یونیورسٹی کے شعبہء اردو میں ایک استاد تھے، جو ڈاکٹر صاحب سے خوش نہ تھے اور ڈاکٹر صاحب بھی ان کی ناراضگی سے واقف تھے، ان سے میرے خوشگوار مراسم تھے۔ وہ مجھ سے ہمیشہ، جب بھی ذکر آتا، ڈاکٹر صاحب کی برائی کرتے رہتے تھے، لیکن میں نے ڈاکٹر صاحب کی زبان سے کبھی ان کی برائی نہیں سنی۔ جب بھی ان کا ذکر کیا خیر کے ساتھ ہی کیا۔

ڈاکٹر صاحب قبلہ ایک عالی مرتبت صوفی ہی نہیں ایک زندہ دل انسان بھی ہیں۔ میری سندھ یونیورسٹی کی ملازمت کے دوران تعطیلات میں ڈاکٹر صاحب قبلہ، خان رشید صاحب مرحوم اور سید یحیٰ احمد ہاشمی صاحب کبھی کبھی مچھلی یا پرندوں کے شکار کے لئے نکل جایا کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نہایت خوشگوار موڈ میں سب کے ساتھ

بے تکلفی سے پیش آتے تھے، جیسے مرید و مرشد اور استاد و شاگرد نہ ہوں، سب ایک دوسرے کے دوست ہوں۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کا طرح نرم

اس کے برخلاف ایک مرتبہ یہ صورت بھی پیش آئی کہ ہم لوگ حضرت نوح ہالائیؒ کے مزار پر جا رہے تھے۔ سجادہ نشین خاندان کے کچھ لوگوں نے اشاریاتی انداز میں مذاق اڑایا تو ڈاکٹر صاحب کو پٹھانی جلال آگیا، خوب ڈانٹا اور سب لوگ خاموشی سے سنتے رہے۔

رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

ایک مرتبہ حیدرآباد سے دور پھلیلی نہر پر بنسیاں ڈالے بیٹھے تھے، قلاقند ساتھ لے گئے تھے، سب لوگوں کی توجہ شکار کی طرف تھی اور میری نظریں ترنے پر تھیں اور ہاتھ قلاقند میں۔ سب کو شیرینی کی طرف میری شدید رغبت کا علم تھا۔ خان رشید صاحب مرحوم نے مجھ سے کہا: مفتی صاحب! قلاقند کی خبر بھی تو لیجئے۔ حضرت ڈاکٹر صاحب نے فرمایا: مفتی صاحب کو اس طرف توجہ دلانے کی ضرورت نہیں، ان کا تو پہلے سے یہ حال ہے "ہاتھ کار میں دل یار میں"۔

اللہ تعالیٰ عافیت کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کا سایہ قائم رکھے اور ان کے فیض کو عام فرمائے۔ آمین۔

حضرت مفتی عبدالمجید صاحبؒ

حضرت قبلہ مفتی عبدالمجید صاحب رحمتہ اللہ علیہ سرونج کی عدالت شرعیہ میں مفتی تھے۔ میری ان سے آخری ملاقات ۱۹۷۹ء میں اس وقت ہوئی جب میں سعودیہ سے سرونج پہنچا تھا۔

اس وقت ان کی بینائی رخصت ہو چکی تھی، حافظہ بھی تقریباً جواب دے چکا تھا اور وہ اس وقت عمر کے اس مرحلے میں تھے جس کے بارے میں فرمایا گیا ہے: ثم یرد إلی أرذل العمر لکی لا یعلم من بعد علم شیئا (پھر سب سے بدتر عمر کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے تاکہ جاننے کے بعد کچھ نہ جانے)۔ شاید آخری عمر میں، جب کہ اللہ کے پاس جانے کے دن قریب ہوتے ہیں، حافظہ اس لئے جواب دے جاتا ہے کہ اللہ کے سوا اور کوئی بات یاد نہ رہے۔

سرونج پہنچ کر جب مفتی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو فرمایا: بیٹا بقا! اللہ کا تجھ پر بڑا فضل ہے۔ جب تو چھوٹا سا تھا تو منشی جی (میرے والد صاحب مرحوم) تجھے میرے پاس لائے تھے کہ اس کی بسم اللہ کرادو۔ میں نے کہا تھا کہ ارے کس شہدے کو میرے پاس لائے ہو۔ بیٹا بقا! اللہ کا تجھ پر بڑا فضل ہے۔

مفتی صاحب مولانا گل حسن شاہ صاحب مرحوم کے خلیفہ تھے۔ مولانا گل حسن شاہ صاحب، حضرت مولانا غوث علی شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے خلیفہ اور پانی پت میں ان کی درگاہ کے سجادہ نشین تھے۔ مفتی صاحب کی تربیت بھی انہیں کے پاس ہوئی۔

میں نے ہوش سنبھالا تو مفتی صاحب کی جوانی ڈھل چکی تھی۔ اور پیری نے بالوں کے جھروکے سے چھب دکھانی شروع کر دی تھی، جس پر وہ خضاب کی چلمن

ڈالے رہتے تھے۔ بلند قامت، سرخ و سپید اور وجیہ و شکیل انسان تھے۔ عطر میں بسا ہوا خوبصورت لباس پہن کر جب وہ کسی راہ سے گزرتے تو باقی رہنے والی مہک سے صاف اندازہ ہو جاتا تھا کہ؛

ابھی اس راہ سے گزرا ہے کوئی

مزاج میں بڑی نفاست و لطافت اور ظاہری حیات میں بے اعتبار رنگینی تھی۔ بالوں کی چونری ہلاتے ہوئے چھوٹے بازار سے گزر کر عصر کے بعد بڑے بازار تک جانا اور تھوڑی دیر رجو لال کی دوکان پر بیٹھنا، جسے انہوں نے خود ہی کپڑے کے دوکان کھلوا دی تھی، ان کا روز کا معمول تھا۔ عام طور پر دو چار آدمی جلو میں ہوتے تھے۔ یہ ساتھی تو بڑے مؤدب رہتے تھے لیکن مفتی صاحب ان سے خوش مزاجیاں فرماتے جاتے تھے۔ کبھی پیدل تشریف لے جاتے، کبھی اس چھوٹے سے ایک نشست والے یکہ پر جسے انہوں نے بطور خاص بنوایا تھا اور یکہ ہی کی مناسبت سے ایک چھوٹا سا خوبصورت گھوڑا اس میں جتا ہوتا تھا۔ جس کی باگ مفتی صاحب کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ کبھی سفید نکل کی نئی سائیکل پر اس شان سے کہ ایک آدمی کے کاندھے پر ہاتھ ہوتا تھا اور پھیوں پھیوں سائیکل چلاتے جاتے تھے۔

لوگوں کے دلوں پر مفتی صاحب کی حکومت اتنی تھی کہ مجال نہ تھی کہ وہ بازار سے گزریں اور دوکاندار، ہندو اور مسلمان کی تفریق کے بغیر عام طور پر کھڑے ہو کر انہیں سلام نہ کریں۔

پورا سرونج ان کی رنگینیٔ مزاج کو جانتا تھا اور پورا سرونج ان سے محبت یا کم از کم ظاہری عزت کرنے پر گویا مجبور سا تھا۔

باہر کے قوال، عطر فروش یا طوائفیں سرونج آئیں تو معمول تھا کہ سب سے پہلے مفتی صاحب کے در دولت پر حاضری دیں۔

ایک مرتبہ ایک "نوخیز حسین بلند و بالا" طوائف سرونج آئی اور حسب معمول

پہلے مفتی صاحب کی خدمت میں پہنچی۔ مفتی صاحب نے اپنے خادم خاص سے فرمایا کہ اسے فلاں مکان میں ٹھہرا دو، یہ ہماری مہمان رہے گی۔ پھر اس کے سرونج میں قیام تک مفتی صاحب کا روز کا یہ معمول رہا کہ شام کو بازار کے لئے نکلتے وقت اس کے پاس جاتے اور تھوڑی دیر بیٹھ کر روانہ ہو جاتے۔

بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ مفتی صاحب نے اپنی رنگینیوں میں ایک دلچسپ اضافہ کیا ہے، لیکن حقیقت یہ تھی کہ خود بدنامی مول لے لی اور قصبہ کے تمام رنگین مزاجوں کو شب خون سے محفوظ کر دیا، کیونکہ پہلے ہی روز سے مفتی صاحب کا نام لگ جانے کی وجہ سے نہ تو کسی کا مجال تھی کہ طوائف کے دروازے پر قدم رکھ سکے اور نہ طوائف کی مجال تھی کہ دروازے سے باہر قدم نکال سکے۔

۶۸ء میں جب مفتی صاحب کراچی تشریف لائے تو استقبال کرنے والوں سے اسٹیشن پر اترتے ہی میرا نام لے کر فرمایا کہ اس کے مکان پر چلو۔ مجھے خبر بھی نہ تھی، دفعتہً پہنچے تو بڑی خوشی ہوئی۔ بچے انڈیا گئے ہوئے تھے اور مکان میں میں تنہا تھا۔

مفتی صاحب کے خادم خاص سے سنا تھا کہ انہوں نے کبھی مفتی صاحب کو رات کے دو بجے کے بعد سوتے نہیں دیکھا۔ یہ تو میں نے بھی سرونج میں کئی بار دیکھا تھا کہ فجر کے بعد سے تلاوت شروع کرتے اور جب تک اشراق سے فارغ نہ ہو جاتے کسی اور کام میں مشغول نہ ہوتے، لیکن شب بیداری کا حال معلوم نہ تھا۔

کراچی میں پہلی رات تو میں نے دیکھا کہ مفتی صاحب میرے سامنے فجر کی نماز کے وقت بیدار ہوئے، شاید اس لئے کہ سفر کی تکان تھی۔ اس کے بعد سے جب تک قیام رہا فجر یا تہجد کے وقت جب بھی میری آنکھ کھلی میں نے مفتی صاحب کو مصلے ہی پر دیکھا۔

مفتی صاحب کو شطرنج کا شوق بھی تھا لیکن دو تین مخصوص حضرات تھے جن کے ساتھ وہ شطرنج کھیلتے تھے، وہ بھی ہفتہ میں صرف ایک بار دوپہر کے وقت۔ مفتی

صاحب ہر ہفتہ مہندی اور وسمہ کا خضاب کیا کرتے تھے ۔ نائی جب خضاب لگا کر چلا جاتا تو وہ دو گھنٹے کے لئے شطرنج کھیلنے بیٹھ جاتے ۔ فرماتے تھے خضاب لگا کر سونا نقصان دہ ہوتا ہے ۔

میرے گھٹنے میں کافی عرصے سے درد تھا ۔ فرمایا میں سرونج پہنچ کر تمہارے لئے لوبان کا تیل بھیجوں گا ، اس سے انشاء اللہ درد جاتا رہے گا ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا ۔ فرماتے تھے کہ میں نے پنسیریوں لوبان پھونکا ہے تب جا کر صحیح طریقے سے لوبان کا تیل نکالنا آیا ہے ۔

ایک روز میں نے عرض کیا کہ سنا ہے کہ ایک بوتل میں تل کا تیل لیا جائے اور ببول کی جڑ کھودی جائے ۔ اس کی ایک جڑ بوتل کے منہ میں اتنی داخل کر دی جائے کہ کارک کا کام دے ۔ پھر بوتل کو گل حکمت کر کے چالیس روز کے لئے وہیں دفن کر دیا جائے تو تیل خود بھی سیاہ ہو جاتا ہے اور بالوں کو بھی سیاہ کرتا ہے ۔ فرمایا : اس کے لئے تین شرائط ہیں : ایک یہ کہ تیل سرسوں کا ہو تل کا نہیں ، کیونکہ سرسوں کے تیل میں قدرے تیزابیت ہوتی ہے اور خضاب اس وقت تک نہیں بنتا جب تک اس میں تیزاب کی لاگ نہ ہو ۔ دوسرے یہ کہ ببول جوان ہو ، بوڑھا یا بچہ نہ ہو ۔ تیسرے یہ کہ چالیس کے بجائے اسی (۸۰) دن دفن کیا جائے ۔ فرمایا کہ میں نے اس کا تجربہ کیا ہے ۔

مفتی صاحب کے مکان کے احاطے میں خودرو نہیں بلکہ لگائے ہوئے ببول کے کئی پیڑ تھے اور تعجب ہوتا تھا کہ پھولوں سے محبت رکھنے والے پھول جیسے انسان کو کانٹوں سے یہ دلچسپی کیوں ہے ۔ اس کا راز اب سمجھ میں آیا ۔

سرونج میں رام چندر ایک نائی تھا ۔ وہ ایک جاگیردار صاحب کے بال بنا رہا تھا کہ کھال کٹ گئی ۔ انہوں نے کہا کہ رام چند تو نے میرا وضو توڑ دیا ۔ اس نے کہا کہ آپ کا وضو نہیں ٹوٹا ، خون اپنی جگہ سے بہا کب ہے ۔ تعجب سے پوچھا کہ ہندو ہو کر تجھے یہ مسئلہ کیسے معلوم ہوا ؟ اس نے جواب دیا : میں مفتی صاحب کے بال جو بناتا ہوں ۔

فرمایا کہ چندا ڈھانہ (سرونج کا ایک گاؤں) کا ایک ہندو پٹیل (مکھیا) بڑا طاقتور تھا۔ اس کی طاقت کی خبر نواب وزیرالدولہ تک پہنچ چکی تھی۔ نواب صاحب سرونج کے دورے پر تشریف لائے تو نذر پیش کرنے کے لئے وہ پٹیل بھی حاضر ہوا اور چنور شاہی روپیہ (ریاست کا مقامی سکہ تھا اور کلدار سے چھوٹا اور موٹا ہوتا تھا) نذر میں پیش کیا۔ نواب صاحب خود بھی اتنے طاقتور انسان تھے کہ گھوڑے پر بیٹھ کر اگر رانیں دبا دیں تو گھوڑے کی زبان نکل آتی تھی۔ نواب صاحب نے پٹیل کے سامنے اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا اور روپیہ کو چٹکی سے اس زور سے مسلا کہ دونوں طرف سے اس کے ابھرے ہوئے نقوش مٹ گئے۔ پھر پٹیل سے کہا کہ ارے فلانے تو نے کھوٹا سکہ نذر کیا ہے۔ پٹیل سمجھ گیا۔ اس نے کہا دیکھوں سرکار: اور روپیہ کو دونوں ہاتھ کی چٹکیوں سے دبا کر دو تین بار اوپر نیچے کر کے دو ٹکڑے کئے اور کہا کہ سرکار درب کا تو اچھا ہے۔ نواب صاحب دنگ رہ گئے۔

فرمایا کہ نواب وزیرالدولہ روزانہ صبح کے وقت پینس میں سوار ہو کر سیر کے لئے نکلا کرتے تھے۔ راستہ متعین تھا، اس راہ میں قافلہ کا محلہ بھی پڑتا تھا، جس میں بیشتر حضرت سید احمد صاحب بریلوی رحمتہ اللہ علیہ کا خاندان آباد تھا۔ سید صاحب کے خاندان میں ایک صاحب تھے کلّو میاں، وہ مدک کے عادی تھے، ہر وقت ٹُن رہتے۔ کلّو میاں نے ملازم سے کہہ رکھا تھا کہ نواب صاحب کی سواری اس طرف سے گذرے تو انہیں خبردار کر دیا کرے۔ چنانچہ نواب صاحب کی سواری قریب آتی تو گھر سے نکلتے۔ نواب صاحب سواری سے اترتے، ان کا ہاتھ اپنے سر پر رکھتے اور فرماتے: کلّو میاں یہ خلافِ شرع ہے اسے چھوڑ دیجئے اور کلو میاں روز مدک پر لاحول پڑھتے۔ سواری سے اتر کر سر پر ہاتھ رکھوانا اور نصیحت کرنا نواب صاحب کا روز کا معمول تھا۔

ایک مرتبہ تین دن گزر گئے اور ملازم نے نواب صاحب کی آمد کی اطلاع نہ دی۔ کلّو میاں نے ملازم سے دریافت کیا: کیا بات ہے سرکار کی سواری کئی روز سے نہیں

گزری؟ ملازم نے جواب دیا: میاں آپ کو ہوش کہاں رہتا ہے، سرکار تو تین روز ہوئے انتقال فرما چکے۔ انا للہ پڑھ کر خاموش ہو گئے۔ کونے کھدروں سے نلکیاں اور مدک کے لوازمات جمع کئے اور سل پر رکھ کر دچلنے لگے۔ ملازم نے کہا: میاں کیا کرتے ہیں، یہ تو آپ کی زندگی ہے۔ جواب دیا: ارے جب ٹوکنے والا نہیں رہا تو پینے کا کیا مزہ۔

اجمیر میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمتہ اللہ علیہ کے عرس میں ہر سال شریک ہونا مفتی صاحب کا معمول تھا۔ اجمیر میں کبھی ان کا قیام میرے تایا زاد بھائی محمد ناصر انصاری مرحوم کے مکان پر ہوتا تھا اور کبھی درگاہ کے ایک حجرے میں جسے وہاں کے خادم خاص طور پر مفتی صاحب کے لئے خالی رکھتے تھے۔

فرمایا کہ ایک مرتبہ اجمیر سے واپسی پر حسب معمول جاورہ رکا اور میاں عبدالرحیم شاہ صاحب (مولانا غوث علی شاہ صاحب کے خلیفہ) کی خدمت میں حاضر ہوا۔ فرمایا کہ سرونج جانے لگو تو اِندور رک کر وہاں کے مجذوب سے ملتے ہوئے جانا۔ میں نے حکم کی تعمیل کی۔ وہ مجذوب آبادی سے باہر مقیم تھے۔ پتہ دریافت کرتے ہوئے رات کو بارہ بجے کے قریب ان کے پاس پہنچا۔ قریب پہنچا تو ایک گٹھری سی نظر آئی۔ اس میں حرکت ہوئی اور مجذوب صاحب ظاہر ہوئے۔ ہاتھ کے اشارے سے کچھ پینے کے لئے مانگا۔ گشت کا سپاہی جو میرے ساتھ ہو لیا تھا، دوڑ کر دودھ لایا۔ انہوں نے کچھ پی کر مجھ سے کہا: صاحب پئیں گے۔ میں نے نفی میں جواب دیا۔ تین بار میرا انکار سن کر دودھ پھینک دیا اور پھر گٹھری میں غائب ہو گئے۔ میں واپس آگیا۔

آئندہ سال اجمیر سے واپسی پر میاں عبدالرحیم شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو سونے سے قبل ان کے پیر دبا رہا تھا۔ فرمایا: میاں گذشتہ سال تم نے مجذوب کا بچا ہوا دودھ کیوں نہ پیا تھا۔ میں نے عرض کیا: حضرت اس کے سوا کیا ہوتا کہ میں بھی انہیں جیسا بن جاتا اور مجذوبانہ زندگی مجھے پسند نہیں۔

سرونج میں آبادی سے دور ایک پہاڑی پر ایک بزرگ شاہ فخرالدین صاحب کا

مزار ہے، اس کے قریب اور بھی بے شمار قبریں ہیں۔ایک قبر ایسی بھی ہے جس کے بارے میں مشہور تھا کہ مجذوب کی قبر ہے۔اس کا احاطہ بنا ہوا تھا اور چھت بھی پڑی تھی لیکن اس طرح کہ پیروں کی جانب کی چھت برقرار تھی اور کمر سے سر تک کے اوپر کی چھت گری ہوئی تھی۔ مشہور تھا کہ کئی بار چھت بنائی گئی ہے۔لیک جب بھی مکمل ہوئی اسی رات اس کا اگلہ حصہ گر جاتا ہے۔

میں نے مفتی صاحب سے دریافت کیا تو فرمایا: ہاں میاں میں نے بھی اس کا تجربہ کیا ہے۔میں نے خود چھت بنوائی اور صبح گری ہوئی ملی۔

ایک روز میں چائے کے لئے دودھ گرم کر رہا تھا، باورچی خانے میں تشریف لے آئے اور دودھ کو کھولتے دیکھ کر فرمایا: میاں اس طرح گرم کرنے سے بالائی پڑجاتی ہے جسے چائے میں ڈالو تو بری معلوم ہوتی ہے اور بالائی ہٹادو تو دودھ کا مزہ کم ہو جاتا ہے۔ چائے کے لئے دودھ اس طرح گرم کیا جاتا ہے کہ جب جوش کے آثار پیدا ہوں اس میں مسلسل چمچہ چلاتے رہیں اور جب جوش آجائے تو اتار لیں۔اس طرح بالائی نہ پڑے گی اور دودھ کا پورا مزہ اس میں برقرار رہے گا۔

ہر چیز کی طرح مفتی صاحب کا چائے کا ذوق بھی بہت نفیس تھا۔نہایت اچھی قسم کی چائے پیتے اور شام کی چائے پر کافی مہمان ہوتے تھے۔ مفتی صاحب کو صرف ۲۴ روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی جس سے یقیناً ان کی چائے کے مصارف بھی پورے نہ ہو سکتے تھے۔نہ معلوم یہ شاہانہ ٹھاٹ باٹ کہاں سے چلتا تھا۔

مفتی صاحب بڑے خوش مزاج انسان تھے، ہر ایک سے مزاح فرماتے اور خندہ پیشانی سے ملتے۔ بایں ہمہ خودداری کا یہ عالم تھا کہ صاحبزادہ عبدالتواب خان صاحب (وزیر) سرونج تشریف لائے۔شریعت کا محکمہ انہی کے تابع تھا۔ مفتی صاحب نہ ان کے استقبال کو گئے اور نہ ان کی قیام گاہ پر۔کسی نے توجہ بھی دلائی تو فرمایا: مجھے ان سے کیا غرض، اگر وہ ملنا چاہیں تو خود آجائیں۔

اس زمانے میں کم از کم سرونج جیسی جگہ میں خوشنما شادی کارڈوں پر پیسے برباد نہ کئے جاتے تھے۔ ایک کاغذ پر مدعوین کے نام لکھ کر نائی کو دے دیئے جاتے تھے اور وہ سب کو اطلاع دے دیا کرتا تھا۔ اس طرح کے مواقع پر اگر ناظم و کلکٹر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس بھی مدعو ہوں تو سب سے اوپر مفتی صاحب ہی کا نام لکھا جاتا تھا۔ عید، بقرعید کے مواقع پر ناظم صاحب اور تمام بڑے افسران خود مفتی صاحب کے پاس جاتے تھے۔ بچے سے بڑے تک اور چھوٹے درجے کے آدمی سے لے کر ناظم صاحب تک مفتی صاحب کی یکساں تعظیم کرتے تھے۔ ان کے رعب کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ سرونج کے ایک ہیڈ ماسٹر نے ایک بیڑھنی (طوائفوں کی ادنیٰ قسم) کو چند آدمیوں کے سامنے اس کے کوٹھے پر قتل کر دیا اور آکر مفتی صاحب سے واقعہ بیان کیا۔ مفتی صاحب نے فرمایا تم میرے پاس رہا کرو، چنانچہ وہ ہر وقت مفتی صاحب کے پاس رہنے لگے۔ شام کو جب مفتی صاحب معمول کے مطابق بازار نکلتے تو وہ بھی ساتھ ہوتے۔ حالانکہ قتل کے عینی شاہد موجود تھے، لیکن پولیس کی مجال نہ تھی کہ مفتی صاحب کی موجودگی میں ان پر ہاتھ ڈال دے۔ بالآخر وہ بری ہوئے۔

فرمایا ایک مرتبہ میں نے جمعہ کی نماز کے بعد بازار میں ایک اجنبی کو دیکھا۔ اس نے مجھ سے دریافت کیا: کیا اس زمانے میں حلال کھانے کی کوئی صورت ہے؟ میں نے جواب دیا: ہاں اس طرح کہ نہ کھائے اور جب جان جانے کا گمان غالب ہو جائے تو بقدر سد رمق کھالے۔

واضح رہے کہ ایسی اضطرار کی حالت میں حرام بھی حلال ہو جاتا ہے اور زیادہ صحیح یہ ہے کہ حرام، حرام ہی نہیں رہتا۔ صرف جان بچانے کی حد تک، نہ کہ پیٹ بھرنے کے لئے۔

ایک مرتبہ فرمایا: میاں تمہارے پاس تذکرہ غوثیہ ہے؟ میں نے جواب دیا: تھی تو لیکن ایک صاحب کو تحفۃً پیش کر دی۔

ملتی ہے؟

جی ہاں۔

خرید لایا۔

میں خرید لایا۔ فرمایا کہ اس میں یہ تعویذ دیکھا ہے؟ میں نے عرض کیا جی ہاں۔ فرمایا کہ جب میں مولانا گل حسن شاہ صاحب کی زیر کفالت تھا اور دیو بند میں پڑھتا تھا، ایک مرتبہ تعطیلات ختم ہونے پر میں دیو بند جانے لگا تو مجھے خیال آیا کہ کاش مولانا صاحب مجھے اس تعویذ کی اجازت دے دیں۔ مولانا صاحب مجھے رخصت کرنے پانی پت کے اسٹیشن تک آئے۔ روانگی کا وقت قریب آیا تو فرمایا: تم ابھی چھوٹے ہو ورنہ ہم تمہیں اس تعویذ کی اجازت دے دیتے۔ مجھے تعجب ہوا کہ میری تمنا جو زبان پر بھی نہ آئی تھی انہیں کیسے معلوم ہوئی۔

مولانا گل حسن شاہ صاحب کے انتقال پر مجھے سجادہ نشینی کے لئے پانی پت بلایا گیا، لیکن میں نے انکار کر دیا۔ برسوں بعد ایک مرتبہ پانی پت پہنچا تو پرانا خادم زندہ تھا، اس نے پہچان لیا اور اسی کمرہ میں ٹھیرایا جس میں رہا کرتا تھا۔ ایک روز عشاء کے بعد مسجد ہی میں بیٹھا کچھ پڑھ رہا تھا، سب جا چکے تھے، صرف ایک صاحب باقی تھے جو صحن میں تیز تیز قدموں سے ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ بالآخر میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور تیز لہجے میں کہا کہ میں صرف تمہارے انتظار میں ہوں اور تم فارغ ہی نہیں ہوتے۔ اٹھو تازہ وضو کرو اور کمرے میں چلو۔ کمرے میں پہنچ کر فرمایا فلاں تعویذ لکھو۔ میں نے عرض کیا کہ حضور اب میرے بس کی بات نہیں، اس کے لئے چار چلّے کون کرے گا۔ ڈانٹ کر فرمایا: چلّے کے لئے تم سے کون کہتا ہے، میں چلّوں کے بغیر تمہیں اس کی اجازت دیتا ہوں۔ چنانچہ انہوں نے نقش بھرنے کی ترکیب بتائی اور تشریف لے گئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ حضرت مولانا غوث علی شاہ صاحب کے خلیفہ تھے اور ان کے خلفاء میں سے صرف وہی اس وقت بقید حیات تھے۔

ایک مرتبہ گرمی کی دوپہر میں سرونج میں ایک سکھ نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ کہا کہ میں دلّی سے اس تعویذ کے لئے آیا ہوں۔ سنا ہے آپ کو اجازت ہے۔ میں نے اسے ٹھیرایا اور ظہر کی نماز کے بعد جب نقش لکھنے کے لئے بیٹھا تو نقش یح صحیح بیٹھتا ہی نہ تھا۔ میں نے جھنجلا کر قلم پھینکا اور زبان سے نکلا کہ میں نے کب خوشامد کی تھی، اور جب از خود بتلایا گیا ہے تو آتا کیوں نہیں۔ تھوڑی دیر بعد پھر داعیہ پیدا ہوا۔ قلم اٹھایا تو نقش صحیح طور پر بھر گیا۔

اس لمبی تمہید کے بعد فرمایا: میاں اگر تم حفاظت سے رکھ سکو تو وہ نقش میں تمہیں لکھ دوں میں نے زعفران لادیا اور مفتی صاحب نے وہ نقش لکھ کر مجھے دے دیا۔ اتفاق سے وہ نقش گم ہو گیا۔ میرے لکھنے پر مفتی صاحب نے دوبارہ وہ نقش بھیج دیا۔ مجھے یاد نہیں کہ یہ نقش بھی میرے پاس ہے یا نہیں اور ہے تو کہاں رکھا ہے ویسے مجھے اس طرح کے تعویذوں کی چنداں قدر نہیں۔ عزّہ اس کا ہے کہ اللہ نے تو میری قسمت ایسی بنائی ہے کہ مٹی میں ہاتھ ڈالوں تو سونا ہو جائے پھر مجھے ان چیزوں کی کیا ضرورت ہے۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ دیوبند میں حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری رحمتہ اللہ علیہ کے پاس رہا کرتا تھا۔ حضرت کشمیری کا معمول تھا کہ فجر کے بعد کتب خانے میں بیٹھ جاتے۔ کبھی کبھی اٹھتے اور کوئی کتاب نکال کر دیکھتے اور پھر آکر بیٹھ جاتے۔ ایک روز میں نے دریافت کیا کہ حضرت اس وقت آپ کون سا وظیفہ پڑھتے ہیں؟ فرمایا: یہ وظیفے کا نہیں میرے مطالعے کا وقت ہے۔ کوئی بھی کتاب ذہن میں لیتا ہوں، اسے پڑھتا جاتا ہوں اور کہیں شبہ ہو تو اٹھ کر دیکھ لیتا ہوں۔

مفتی صاحب بے انتہا فیاض آدمی تھے۔ کیسی ہی قیمتی چیز ہو، کسی شخص کے منہ سے اگر اس کی تعریف نکل گئی تو بس اسی کی ہو گئی۔

ایک مرتبہ مفتی صاحب نے مجھے تسبیح پڑھتے ہوئے دیکھ لیا۔ فرمایا: اچھا میاں تمہیں تسبیح کا بھی شوق ہے؟ پھر اپنے بکس سے چاندی کی ایک خوبصورت تسبیح نکال کر

دی، جس میں ہر دوسرے دانے پر سونے کا پانی چڑھا ہوا تھا۔ بعد میں میں نے وہ تسبیح ایک سنار کو بتائی کہ اس کی قیمت کیا ہوگی؟ کہا کہ اس میں چاندی تو تقریباً پچیس روپے کی ہوگی لیکن دانے کاٹنے اور پچاس دانوں پر سونے کا ملمع کرنے کی لاگت سو روپے سے کم نہ ہوگی۔ یہ ۱۹۶۸ء کی بات ہے۔

فرمایا کہ نواب وزیر الدولہ ایک مرتبہ پینس پر بازار سے گزر رہے تھے۔ ایک سپاہی کو دیکھا، ڈاڑھی اور سر کے بال پریشان اور گرد آلود۔ رک کر دریافت کیا کہ تیل کیوں نہیں لگاتا، کنگھا کیوں نہیں کرتا کہ یہ مسنون ہے۔ سپاہی نے جواب دیا: سرکار تم (میرے زمانہ تک لوگ نواب سعادت علی خان کو تم کے لفظ سے خطاب کیا کرتے تھے) چار روپے ماہوا تو تنخواہ دیتے ہو۔ اس میں اپنا اور بچوں کا پیٹ پالوں یا یہ سنت ادا کروں؟ حکم دیا کہ اس کے تیل اور کنگھے کے لئے دو روپے ماہوار مقرر کر دیئے جائیں۔ ایک روز پھر اسی سپاہی کو اس طرح کھڑے دیکھا کہ ڈارھی تو قاعدہ میں تھی لیکن سر کے بال پریشان۔ سبب دریافت کیا تو سپاہی نے جواب دیا: سرکار دو ہی روپے تو مقرر کئے ہیں وہ ڈاڑھی کے تیل کنگھے میں صرف ہو جاتے ہیں، سر کے لئے کہاں سے لاؤں؟ فرمایا: سر منڈا دے۔

اکبر خان دادا ایک سپاہی تھے۔ انہیں میں نے بھی دیکھا ہے جب کہ وہ بہت ضعیف ہو چکے تھے۔ مفتی صاحب نے ان کا حیرت انگریز واقعہ بیان کیا۔ فرمایا کہ اکبر خان صاحب کے دادا مولانا غوث علی شاہ صاحب کے معتقد تھے مولانا غوث علی صاحب ہر سال اجمیر جاتے تھے اور سرونج میں اکبر شاہ خان کے دادا کے پاس کچھ روز قیام کرتے تھے۔ اکبر شاہ خان کے دادا کی صرف پوتیاں تھیں، پوتا کوئی نہ تھا۔ انہوں نے ایک مرتبہ مولانا سے پوتے کے لئے دعا کی درخواست کی۔ دوسرے سال جب سرونج سے مولانا کا گذر ہوا تو ان کے قیام کے دوران ہی پھر پوتی ہوئی۔ مولانا کو اطلاع دی گئی تو فرمایا کہ یہاں لاؤ اور بچی کو گود میں لے کر فرمایا کہ لڑکی کہاں ہے یہ تو لڑکا ہے اور خود ہی لڑکے کا نام اکبر خان رکھا۔

مفتی صاحب نے فرمایا کہ بڑھاپے میں جب اکبر خان ملازمت کے قابل نہ رہے تو ایک روز میرے پاس آکر کہنے لگے کہ میاں اب تو ملازمت میرے بس کی نہیں رہی۔ میں نے کہا کہ اپنے دادا کی قبر پر جا کر کہو کہ لڑکی سے لڑکا بنوا کر آپ نے مصیبت میں مبتلا کر دیا۔ لڑکی ہی رہتا تو میری فکر دوسروں کو ہوتی۔ اب جب کہ ملازمت بس کی نہیں رہی میں کیا کروں۔ اکبر خان گئے اور دادا کی قبر پر کھڑے ہو کر یہی کہہ آئے۔ اتفاق سے ان دنوں نواب سعادت علی خان شیر کے شکار کے لئے سرونج آئے ہوئے تھے۔ کورٹ کے دروازے سے گذرے تو اکبر خان پہرے پر تھے۔ انہیں دیکھ کر گاڑی روکی اور اکبر خان صاحب سے اپنے سر پر ہاتھ رکھوایا۔ اور کہا کہ اکبر خان اب آپ بہت بوڑھے ہوگئے، گھر بیٹھیں اور آپ کی تنخواہ آپ کے گھر ہی پہنچ جایا کرے گی۔ نواب سعادت علی خان کا ہمیشہ سے دستور تھا کہ جب بھی سرونج آتے اور پہرے پر اکبر خان کو دیکھتے تو گاڑی روک کر ان سے اپنے سر پر ہاتھ رکھواتے تھے۔

مفتی صاحب ہر سال عرس کے موقع پر اجمیر تشریف لے جاتے تھے۔

میرے پھوپھا سسر حافظ محمود خان صاحب نے (جو ثقہ بزرگ ہیں) بیان کیا کہ ایک مرتبہ اجمیر تشریف لے گئے۔ میں بھی ساتھ تھا۔ قوالی کی محفل جمی۔ سردی کا زمانہ تھا اور مفتی صاحب سردی کا پورا لباس پہنے ہوئے تھے اور جبہ بھی تھا۔ ایک شعر پر انہیں وجد آیا اور بہت دیر تک وجد کی کیفیت رہی۔ پہلے تو انہوں نے قوال کو پیسے دینا شروع کئے، پیسے ختم ہوئے تو جبہ اتار کر دیا۔ پھر ایک ایک کر کے سارے کپڑے اتار کر قوال کے نذر کر دیئے اور صرف لنگی باندھ کر باہر نکلے۔ جیسے ہی سماع خانہ سے باہر قدم رکھا ایک شخص طشت میں جوڑا لئے کھڑا تھا۔ پوچھا کس نے بھیجا ہے؟ جواب دیا: اس نے جس کے آپ مہمان ہیں۔ حافظ محمود خان صاحب نے فرمایا کہ یہ میرے سامنے کا واقعہ ہے۔

حضرت مفتی کا تعلق مولانا غوث علی شاہ صاحب کے سلسلے سے تھا اور جو شخص بھی مولانا غوث علی شاہ صاحب کے حالات سے باخبر ہوا سے مفتی صاحب کے حالات پر تعجب نہ ہوگا۔

مولوی عبدالسمیع صاحب

مولوی عبدالسمیع صاحب مرحوم، جیسا کہ قاری سید فصیح احمد صاحب کے تذکرے میں گذرا، حافظ محمود الحسن صاحب مرحوم کے خلیفہ تھے ۔ قاری صاحب اور مولانا محمود الحسن صاحب کے علاوہ بھی سرونج میں ان کے متعدد مرید تھے ۔ موصوف تقریباً ہر سال سرونج تشریف لاتے تھے ۔ ہم اس وقت اگرچہ طالب علم تھے اور اس قابل نہ تھے کہ کسی کے مرید ہوتے تاہم مولوی عبدالسمیع صاحب مرحوم جب اپنے مریدوں کے ساتھ سرونج کے اطراف میں واقع نزدیک اور دور کے اولیاء اللہ کے مزارات پر جاتے تو تقریباً ہر موقع پر ہم بھی ہمسفر ہوتے تھے ۔ موصوف کو کشف قبور بہت ہوتا تھا اور اہل قبور کے بہت سے واقعات ہم ان سے سنا کرتے تھے ۔

موصوف نے ایک مرتبہ ایک عجیب بات یہ فرمائی کہ جب ملکوں میں آپس میں جنگیں ہوتی ہیں تو وہاں کے اصحاب خدمت بھی ان کے ساتھ جنگوں میں شریک ہوتے ہیں اور انہیں بھی دوسروں کی طرح فتح و شکست سے دوچار ہونا پڑتا ہے ۔ فرمایا کہ دوسری جنگ عظیم میں ہماری ڈیوٹی بھی جرمنی کی طرف سے تھی ۔ واللہ اعلم ۔

پیر صاحب دیول شریف

۱۹۸۰ء میں جب مجھے قائد اعظم یونیورسٹی کی شریعہ فیکلٹی میں (جو اب جامعہ اسلامیہ کے نام سے مستقل یونیورسٹی ہے) مختصر عرصہ کے لئے مکہ مکرمہ کی جامعہ اُم القریٰ کی طرف سے اُصول فقہ پڑھانے کے لئے اسلام آباد بھیجا گیا تو ایک روز مغرب کے بعد پیر صاحب دیول شریف کی خدمت میں بھی حاضر ہوا، جو ایوب خان مرحوم کے پیر ہونے کی وجہ سے زیادہ مشہور تھے۔ اتفاق سے وہ دن مریدوں کے اجتماع کا دن تھا۔ حلقہ ء مریداں میں ایک اجنبی چہرہ دیکھ کر میری طرف ملتفت ہوئے۔ میں نے اپنا تعارف کرایا تو التفات زیادہ بڑھا۔ مریدوں سے معذرت کرکے مجھے خلوت میں لے گئے فرمایا کہ جو کام میرے لائق ہو بتائیں۔ چونکہ بڑے لوگ خصوصاً فوجی افسران کے حلقہ بگوش تھے اس لئے سمجھے کہ شاید میں کسی سفارش کے لئے آیا ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ میں تو صرف نیاز حاصل کرنے حاضر ہوا ہوں۔ ان کا التفات مزید بڑھ گیا۔ چائے پلائی اور کچھ وظائف اپنے قلم سے لکھ کر دیئے کہ انہیں پڑھ لیا کرنا۔

اس کے بعد خلوت سے جلوت میں آئے۔ سب لوگ فرش پر تھے اور وہ صوفے پر۔ مجھ سے معذرت کرتے ہوئے فرمایا کہ کولھے میں مستقل تکلیف کی وجہ سے نیچے بیٹھنے میں مجھے تکلف ہوتا ہے۔ چونکہ جان چکے تھے کہ میں دیوبند سے فارغ التحصیل ہوں اس لئے سرگوشی کے انداز میں فرمایا کہ حلقے کے معمولات میں کھڑے ہو کر صلاۃ و سلام پڑھنا بھی ہے، آپ کو اعتراض ہو تو اسے ترک کر دیں۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے کوئی اعتراض نہیں، آپ حسبِ دستور اپنے معمولات انجام دیں۔ چنانچہ سب کھڑے ہوئے تو میں نے بھی ساتھ دیا، محض آداب ملحوظ رکھنے کی خاطر۔

حلقے سے فراغت کے بعد میرے لئے اعلان فرما دیا کہ میں نے ان کو خلافت دی

اور مبارک باد کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ جب نذریں پیش کرنے کا سلسلہ چلا تو میں خاموش بیٹھا تھا۔ ایک صاحب نے میرے ہاتھ پر دو روپئے رکھ کر نذر پیش کرنے کا اشارہ کیا۔ میں نے وہ روپئے تو واپس کر دیئے اور اپنے بٹوے سے پچاس روپئے کا نوٹ نکال کر بطورِ نذر پیش کر دیا۔ سعودیہ کی کمائی تھی، پچاس روپئے کی نظر میں کیا اہمیت ہوتی جب کہ تنخواہ کے علاوہ اسلام آباد میں قیام کے دوران ٹی۔اے، ڈی۔اے کے طور پر ساڑھے تین سو روپیہ (پاکستانی) یومیہ الاؤنس بھی مل رہا تھا۔

اس کے بعد لنگر کا سلسلہ چلا۔ مجھے اپنے ساتھ محبت سے بیٹھایا اور مختلف چیزیں میری طرف بڑھاتے ہوئے فرمایا کہ ہفتہ واری لنگر کا انتظام اسی نذر سے ہوتا ہے۔

پیر صاحب کی بزرگی کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا اس لئے کہ اپنی "شپرہ چشمی" کی وجہ سے اگر میں نہ دیکھ سکا تو "چشمہ آفتاب راچہ گناہ" البتہ ان کے وقار، متانت، اخلاق اور محبت سے میں بے انتہاء متاثر ہوا اور بزرگی کے ساتھ جب یہ عناصرِ اربعہ جمع ہو جائیں تو مقبولیت میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات مزید بلند فرمائے۔

حافظ فضل الرحمٰن صاحب

حافظ فضل الرحمن صاحب اپنے والد حضرت شاہ زوار حسین صاحب مرحوم کی طرح باوقار، باحیا، سنجیدہ، ذہین اور کم گو انسان ہیں اور اپنے والد ہی کی طرح خاموشی سے تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں۔

ایس۔ ایم۔ کالج سے انٹر سائنس کرنے کے دوران حافظ صاحب کا قیام میرے ساتھ سندھ مدرسے کے مکان میں تھا۔

ایک مرتبہ ہم سب مکان میں تالا لگا کر گئے اور واپس آئے تو تالا کھلا ہوا دیکھا۔ سوچا کہ شاید خود ہی تالا لگانا بھول گئے ہوں گے۔ چند روز بعد دوبارہ سب لوگ باہر گئے اور واپسی پر دیکھا کہ نہ صرف تالا بلکہ دروازہ بھی چوپٹ کھلا ہے۔ گھر کی چیزوں کا جائزہ لیا تو ہر چیز اپنی جگہ موجود تھی۔ دل میں کچھ کھٹک سی ہوئی کہ یہ معاملہ کیا ہے۔

ایک مرتبہ حافظ صاحب کا قیمتی بال پوائنٹ غائب ہو گیا۔ میں نے گھر کے ہر فرد سے پوچھا، کسی کو خبر نہ تھی۔ دوسرے روز وہ بال پوائنٹ حافظ صاحب کے تکیہ کے نیچے سے اس طرح ملا کہ اس کے تمام اجزاء جدا جدا تھے۔

اس موقع پر میں نے کہا: حافظ صاحب، کیا جنات تو آپ کے ساتھ نہیں؟ شرما کر خاموش ہو گئے اور جب میں نے بہت زیادہ اصرار کیا تو بتایا کہ میرے ساتھ کچھ غیر معمولی واقعات تو پیش آتے رہتے ہیں۔ میں نے ان کی تفصیل پر اصرار کیا تو کہا: کبھی کبھی اگر میں دیر سے گھر آتا ہوں اور سندھ مدرسے کے میدان میں اندھیرا سا ہوتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ کچھ لوگ تالپور ہاؤس کی طرف سے دوڑتے ہوئے آئے اور میرے سامنے سے گذر کر کالج کی دیوار میں غائب ہو گئے۔ میں نے مزید کریدا تو بتایا کہ کبھی کبھی خیرپور نامے والی میں بھی ایسا ہوتا تھا کہ میں کنوئیں سے پانی اپنے گھر لا رہا ہوں

اور کسی نے گھڑا کاندھے پر اٹھا لیا، میں چلتا جارہا ہوں اور گھڑا میرے ساتھ ساتھ کاندھے کے اوپر چل رہا ہے۔ جب گھر قریب آیا تو گھڑا کاندھے پر آگیا۔

حافظ صاحب چونکہ انتہائی ثقہ آدمی ہیں اس لئے ان کے بیان میں جھوٹ کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔

شاہ عبدالوہاب صاحب

حیدر آباد سندھ میں شاہ عبدالوہاب صاحب کا مزار ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ یہ بزرگ شاہ عبدالقادر جیلانیؒ کے اخلاف میں سے ہیں ۔یہاں وہ تمام بدعات ہوتی رہتی ہیں جو عام طور پر ایسے مقامات پر ہوتی ہیں ۔

۱۵۔شعبان کی رات کو پروفیسر خان رشید صاحب مرحوم کے ساتھ قبرستان گیا اور واپسی پر ہم دونوں شاہ عبدالوہاب صاحب کے مزار پر مراقب ہوئے ۔ مراقبے کے عالم میں، میں نے اپنی تقریباً ساڑھے تین ماہ کی شیر خوار بچی کی نعش اپنے ہاتھوں پر دیکھی ۔ گھبرا گیا کہ یہ رات تو زندگی، موت اور رزق کے تعین و تقسیم کی رات ہوتی ہے، جیسا کہ بعض روایات میں آتا ہے ۔

رمضان میں وہ بچی بیمار ہوئی اور ۲۰۔ رمضان کو اس کا انتقال ہو گیا ۔ بیوی کے مقابلے میں مجھے اس کی موت کا صدمہ کم ہوا ۔ایک تو اس وجہ سے کہ مرد کا دل عورت کے دل کے مقابلے میں قوی ہوتا ہے، دوسرے اس وجہ سے بھی کہ ۱۵۔شعبان ہی سے اس کی موت میرے تصور میں تھی ۔

کوئٹہ میں ایک بزرگ تھے جن کی وضع قطع فیشن ایبل مولویوں کی سی تھی، پیروں جیسی نہ تھی ۔ ڈاڑھی صرف ایک مشت، جسم پر شیروانی اور سر پر جناح کیپ ۔ کوئٹہ میں موٹر کے اسپئر پارٹس کی دوکان کرتے تھے ۔ حیدرآباد میں یوسف اسحاقی صاحب مرحوم کے مکان پر ان سے ملاقات ہوئی ۔ گفتگو کے دوران فرمایا کہ میں نے تو زندگی میں دو ہی آدمی تیار کئے ہیں ۔جو چاہے آزما کر دیکھ لے ۔ان میں سے ایک عاقل اسحاقی صاحب ہیں دوسرے نعیم صاحب ۔ میں دونوں کو جانتا ہوں ۔ عاقل اسحاقی صاحب، یوسف اسحاقی صاحب مرحوم کے چھوٹے بھائی ہیں اور نعیم صاحب ان دنوں

غالباً لائلپور (فیصل آباد) میں کسی مل کے منیجر تھے۔ دونوں کلین شیو تھے۔

ایک دن میں اور نعیم صاحب اسحاقی صاحب مرحوم کے مکان پر بیٹھے تھے۔ اسحاقی صاحب مرحوم نے کہا: نعیم صاحب! مظہر بقا صاحب کو بھی شاہ عبدالوہاب صاحب کی زیارت کرادیں۔ انہوں نے جواب دیا: جب چاہیں۔ چنانچہ مغرب کے بعد کا وقت مقرر کر لیا۔ دونوں مغرب کے بعد مزار پر مراقب ہوئے۔ تھوڑی دیر بعد نعیم صاحب نے "حق حق" کے زور زور سے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ ان کے خاموش ہونے کے تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ بہت گہرا نیلگوں پانی ہے، میں بلند کنارے پر بیٹھا ہوں، دور سے گلاب کا ایک پھول تیرتا ہوا آرہا ہے۔ وہ پھول کنارے سے لگا اور اس کے فوراً بعد گنبدِ خضرا، نظر آیا۔ یہ منظر غائب ہوا تو دیکھا کہ ایک بزرگ کرتا پاجامہ پہنے، عمامہ باندھے قرآن کریم پڑھ رہے ہیں۔ قرآن کریم سامنے رحل پر رکھا ہے۔ ان بزرگ میں جو خاص چیز نظر آئی وہ یہ کہ ان کی ڈاڑھی کے بال بالکل سونے کے رنگ کے تھے۔

مراقبہ ختم کر کے ہم مسجد میں آئے اور چونکہ عشاء کی نماز میں تھوڑی دیر تھی اس لئے صحن میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ میں نعیم صاحب سے ان بزرگ کی ڈاڑھی کا رنگ دریافت کروں گا، کیونکہ سفید ریش تو سب ہی ہوا کرتے ہیں۔ نعیم صاحب نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تھے اور آپؐ نے شاہ عبدالوہاب صاحب کو حکم دیا ہے کہ ان کی (مظہر بقا کی) تربیت کریں اور شاہ عبدالوہاب صاحب نے فرمایا کہ آپ مزار پر آیا کریں۔ اس کے بعد خود ہی کہا کہ شاہ عبدالوہاب صاحب میں عجیب بات یہ ہے کہ ان کی ڈاڑھی کا رنگ بالکل سنہرا ہے۔ میری بے توفیقی کہ اس کے بعد بھی میں نے مزار پر آمد و رفت نہ رکھی۔

مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا شبیر احمد عثمانی

مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری رحمتہ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے تقریر کا بڑا اچھا ملکہ عطا فرمایا تھا۔ روتوں کو ہنسانا، ہنستوں کو رلانا ان کے لئے معمولی بات تھی۔ مجھے ان کی تقریر سننے کا دو مرتبہ اتفاق ہوا۔ ایک مرتبہ سہارنپور میں کہ عشاء کے بعد انہوں نے تقریر شروع کی اور فجر کی اذان پر ختم کی۔ پوری رات ہنستے اور روتے گذر گئی، مجال ہے کہ نیند نے پلکوں سے آنکھ مچولی بھی کی ہو۔

دوسری بار دہلی میں جمعیتہ علمائے اسلام کے سالانہ اجلاس میں یہ کہہ کر تقریر شروع کی کہ دلی والو! میں تم سے ناراض ہوں، کوئی تقریر نہیں کرنا چاہتا۔ یہ کہہ کر صرف ڈھائی گھنٹہ تقریر کی۔ جو شخص ساری ساری رات تقریر کا عادی ہو اس کے لئے صرف ڈھائی گھنٹہ بولنا نہ بولنے کے برابر تھا۔

مولانا عطاء اللہ شاہ کی تقریر کے بعد مولانا شبیر احمد عثمانی رحمتہ اللہ علیہ کی باری تھی اور جب ان کی باری آئی تو ہجوم پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔ ٹکٹ (جو چار آنہ کا تھا) ختم کر کے پنڈال کے پردے اٹھا دیئے گئے۔

مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری اس کے حق میں تھے کہ ہندوستان کو مکمل آزادی ملنی چاہیئے۔ وقتی طور پر وزارتیں دینا ایسا ہی ہے جیسے طوطے کو پنجرے سے نکال کر کمرے میں قید کر دینا۔ مولانا عثمانی ان وقتی وزارتوں کے حق میں تھے۔ فرمایا کہ پنجرے میں قید رہتے ہوئے طوطے کے بازو قوتِ پرواز کھو چکے ہیں، سر تیلیوں سے ٹکرا ٹکرا کر زخمی ہو چکا ہے، پنجرے سے کمرے کا نسبتہً وسیع میدان میسر ہو گا تو پر پھڑپھڑائے گا، بازوؤں میں پرواز کی قوت پیدا ہو گی اور سر کے زخم مندمل ہوں گے، اس لئے عارضی حکومت قبول کر لینی چاہیئے۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب غیر منقسم ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت تھی اور وہ ہندوستانیوں کو انٹریم گورنمنٹ دینے کے لئے تیار ہو گئے تھے۔

مولانا محمود حسن خاں صاحب مرحوم

معجم المصنّفین (جس کی چار جلدیں شائع بھی ہو چکی ہیں) کے مؤلف مولانا محمود حسن خان صاحب جو ٹونک کے باشندے تھے، جلیل القدر عالم ہونے کے ساتھ ظریف بھی تھے۔ ایک مرتبہ نماز پڑھ رہے تھے۔ اتفاق سے امام صاحب کے قریب ایک سوراخ سے چیونٹیوں کا غول نکل آیا اور امام صاحب کے پیروں اور پنڈلیوں پر چڑھنے لگا امام صاحب نے فرفر نماز ختم کی۔ ایک صاحب نے کہا کہ یہ بھی کوئی نماز ہوئی۔ مولانا محمود حسن خان صاحب نے فرمایا: اس سے اچھی ہماری نماز تو آج تک ہوئی ہی نہیں، "اللہ اکبر، اللہ اکبر" ظالم نے اتنی مہلت ہی نہیں دی کہ اللہ سے ہٹ کر خیال کہیں بھٹک سکتا۔

ایک مرتبہ موصوف کو رمضان میں دستوں کی شکایت ہو گئی۔ روزہ رکھتے تو دست آنے لگتے، چھوڑ دیتے تو بند ہو جاتے۔ کسی نے اس پر تعجب کیا تو فرمایا: شیخ سعدی پہلے ہی فرما گئے ہیں:

خدا گر بحکمت ببندد درے
کشاید بفضل و کرم دیگرے

(اگر خدا حکمت سے ایک دروازہ بند کرتا ہے
تو فضل و کرم سے دوسرا دروازہ کھول دیتا ہے)۔

دستور کے مطابق دوسرے علماء کے ساتھ مولانا محمود حسن خان صاحب بھی سلام کے لئے نواب صاحب کے درِ دولت پر حاضری دیتے تھے۔ البتہ علماء کے لئے یہ رعایت تھی کہ وہ نواب صاحب کی تشریف آوری پر کھڑے ہونے کے ادب سے مستثنیٰ تھے۔ مولانا محمود حسن خان صاحب جب بھی پہنچتے نواب سعادت علی خان ان کا ہاتھ پکڑ

کر اپنے سر پر رکھتے۔ ایک مرتبہ مولانا نے فرمایا ارے تمہارے سر پر میرے ہاتھ سے کیا ہو گا۔ تم میرے سر پر اپنا پیر بھی رکھ دو تو بھلا ہو جائے گا۔

مولانا محمود حسن خان صاحب کے سارے بال سفید ہو جانے کے بعد از سر نو سیاہ ہو گئے تھے۔ مفتی ولی حسن صاحب نے بیان کیا کہ مولانا نے بھلاواں لے کر اس کی کھاد بنائی تھی اور اسے مٹی میں ملا کر اس میں سات کونڈوں میں میتھی بو دی تھی اور روزانہ ایک کونڈے کی بھاجی کاٹ کر کھاتے تھے۔ بالوں کی سیاہی اسی کا اثر تھا۔

شیخ محمد محمود شعبان

شیخ محمد محمود شعبان مصری، قاہرہ کی جامعہ الازہر سے کراچی یونیورسٹی کے عربی اور اسلامیات کے شعبوں میں عربی ادب پڑھانے کے لئے بھیجے گئے تھے۔ میں اس زمانے میں شعبۂ معارف اسلامیہ کا صدر تھا۔ رفتہ رفتہ موصوف کے مجھ سے بہت قریبی تعلقات ہو گئے۔ حافظ قرآن اور بڑے ذاکر و شاغل آدمی تھے، سلسلۂ جنیدیہ میں بیعت تھے۔

میں ان دنوں قرآن کریم حفظ کر رہا تھا اور ان کو سنایا کرتا تھا، تاکہ اس بہانے ان سے عربی میں گفتگو کا کچھ موقع میسر آجایا کرے۔

شعبان صاحب ایک مرتبہ عمرہ کے لئے تشریف لے گئے اور واپس آکر مجھے حسبِ ذیل قصہ سنایا:

مدینہ منورہ میں ایک افریقی ہیں جو نمازوں کے اوقات میں ریاض الجنتہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے دروازے کے پاس بیٹھتے ہیں۔ وہ اپنے وطن میں دولت مند اور امیر کبیر تھے۔ عمرہ پر آئے، مدینہ منورہ میں ایسا دل لگا کہ واپس جانے کو جی نہ چاہا۔ ویزا کی مدت ختم ہوئے خاصا عرصہ گذر گیا اور وہ پولیس کی نظر میں آگئے۔ کھانے اور بیت الخلا کے لئے نکلنے کے علاوہ وہ تہجد کے بعد سے عشاء کے بعد تک مسجد نبوی ہی میں رہتے تھے۔ ایک دن پولیس کا ایک کپتان دو سپاہیوں کے ساتھ انہیں گرفتار کرنے کے لئے مسجد میں داخل ہو گیا اور جونہی کپتان نے انہیں پکڑا وہ روضۂ اقدس کی جالیاں پکڑ کر چلائے: "یا رسول اللہ! میں آپ کا مہمان ہوں اور یہ لوگ مجھے نکالنا چاہتے ہیں"۔ جالیوں سے ایک مقدس ہاتھ برآمد ہوا جس نے ان افریقی کا بازو پکڑ لیا اور یہ آواز آئی: "**نعم هذا ضيفي**" (ہاں یہ میرا مہمان ہے)۔ کپتان پر اس کا اتنا

اثر ہوا کہ اسی وقت کاندھے پر کے ستارے نوچ کر پھینک دیئے اور کہا کہ اب تو میں حکومت کی ملازمت کے بجائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مہمان کی خدمت کروں گا۔اس وقت سے اب تک کپتان ان کے ساتھ خادم کی حیثیت سے رہتا ہے۔

عمرہ کے بعد شعبان صاحب حج کے لئے گئے اور واپس آکر پھر بتایا کہ اس مرتبہ میں نے ان افریقی سے معانقہ بھی کیا اور ان سے دعا کی درخواست کی۔

میرا تو ہر سال کئی بار مدینہ منورہ جانا ہوتا ہے۔میں نے ایک مرتبہ ایک افریقی کو نماز کے بعد اس طرح ریاض الجنتہ سے جاتے ہوئے دیکھا ضرور ہے، جن کے پیچھے دو تین عرب اس طرح جارہے تھے جیسے کسی بزرگ کے پیچھے جاتے ہیں۔میں نے ایک عرب سے دریافت بھی کیا کہ یہ کون ہیں، تو اس نے جواب دیا کہ ایک بزرگ ہیں۔

مدینہ منورہ میں اپنے جاننے والوں سے اس واقعہ کی تصدیق کرنی چاہی تو کسی کو خبر نہ تھی۔یہ بات بھی ہے کہ سعودیہ میں اس طرح کے واقعات کو ہوا نہیں دی جاتی بلکہ چھپایا جاتا ہے۔

شیخ محمد شعبان اگر ثقہ بزرگ نہ ہوتے تو میں اس واقع کو نقل نہ کرتا۔

جب میں مصر گیا تو قاہرہ میں شعبان صاحب کے گھر جا کر ان کی زیارت کی۔بیوی اور میری بچی ساجدہ ساتھ تھے۔انہوں نے کھانے کا بڑا اہتمام کیا اور مجھ سے دریافت کیا کہ کھانا سب لوگ ساتھ بیٹھ کر کھائیں گے یا مرد اور عورتیں علحدہ علحدہ؟ اور یہ اس لئے دریافت کر رہا ہوں کہ مصر کی جدید تہذیب میں اگر مخلوط طور پر کھانا نہ کھایا جائے تو اسے مہمان کے اعزاز کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔میں نے کہا: آپ کو معلوم ہے کہ ہم تو پردہ کرتے ہیں، میری بیوی اور بچی اس وقت بھی برقعے پہن کر آئی ہیں۔چنانچہ ہم نے علحدہ علحدہ کھانا کھایا۔

ڈاکٹر راشد خلیفہ

ڈاکٹر راشد خلیفہ امریکہ کی ایریزونا اسٹیٹ میں توسان (TUCSAN) کی مسجد کے امام ہیں ۔ انہوں نے انگریزی میں قرآن کریم کے ترجمے کے علاوہ متعدد کتابیں لکھیں ہیں، جن میں سے دو حسب ذیل ہیں:

1. The Computer Speaks,

   God's Massage to the World

2. Quran – Visual Presentation of the Miracle

ان کتابوں میں انہوں نے کمپیوٹر کے ذریعہ قرآن کریم کا یہ اعجاز پیش کیا ہے کہ پورے قرآن میں (۱۹) کے عدد کی رعایت ہے ۔ **بسم الله الرحمن الرحيم** کے حروف (۱۹) ہیں ۔ اس میں چار لفظ ہیں:

۱۔ اسم، ۲۔ اللہ، ۳۔ رحمٰن، ۴۔ رحیم

ان میں سے لفظ " اسم " قرآن میں ٹھیک (۱۹) جگہ ہے ۔ دوسرا لفظ " اللہ " قرآن میں (۲۶۹۸) جگہ ہے، یہ مساوی ہے ۱۹ X ۱۴۲ کے ۔ تیسرا لفظ " رحمٰن " قرآن میں (۵۷) جگہ ہے، جو مساوی ہے ۱۹ X ۳ کے ۔ چوتھا لفظ " رحیم " ہے، یہ قرآن میں (۱۱۴) مقامات پر ہے، جو مساوی ہے ۱۹ X ۶ کے ۔

اسی طرح قرآن کی ۱۱۴ سورتیں ہیں یعنی ۱۹ X ۶ ۔

اس طرح وہ (۱۹) کے عدد کو پورے قرآن پر پھیلاتے جاتے ہیں ۔

میں نے ان کی کوئی کتاب نہیں پڑھی، لیکن ڈاکٹر راشد خلیفہ کے بارے میں مجھے وثوق کے ساتھ معلوم ہے کہ وہ سُنت کا سرے سے انکار کرتے ہیں ۔ انہوں نے اذان میں سے " **محمد رسول الله** " کو نکال دیا ہے، اس آیت سے استدلال

کرتے ہوئے کہ "أن المساجد لله فلا تدعوا مع الله احدا" (مساجد اللہ کے لئے ہیں، لہٰذا اللہ کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو)۔

ان کے افکار میں اس طرح کی اور بھی گمراہیاں ہیں۔

میرے خیال میں ان کی یہ گمراہیاں تو اپنی جگہ ہیں، لیکن اگر واقعتاً انہوں نے (۱۹) کے عدد کو صحیح طور پر پورے قرآن پر منطبق کیا ہے تو بلاشبہ قرآن کا یہ اعجازی پہلو ہوگا، تاوقتیکہ حسابی طریقہ پر ہی اس کی تغلیط نہ کی جائے۔

ایک عجیب بات ڈاکٹر خلیفہ راشد نے یہ کہی ہے کہ سورہ توبہ (نویں سورت) کی آخری دو آیات (لقد جاءکم ...) کے بارے میں ابن کثیر، سیوطی اور بخاری لکھتے ہیں کہ جمع قرآن کے لئے حضرت زید بن ثابت نے جو معیار مقرر کیا تھا اس پر یہ دونوں آیات پوری نہ اتری تھیں۔ اور میرے (۱۹) کے حساب پر بھی پوری نہیں اترتیں۔ وہ کہتے ہیں کہ:

رسول	۱۱۴	جگہ ہے	=	۱۹x ۶
انفس	۱۵۲	جگہ ہے	=	۱۹x ۸
رحیم	۱۱۴	جگہ ہے	=	۱۹x ۶
تولوا	۱۹	جگہ ہے	=	۱۹x ۱
اللہ	۲۶۹۸	جگہ ہے	=	۱۹x ۱۴۲
الہ	۹۵	جگہ ہے	=	۱۹x ۵
توکلت	۵۷	جگہ ہے	=	۱۹x ۳
رب	۹۶۹	جگہ ہے	=	۱۹x ۵۱
العرش	۱۹	جگہ ہے	=	۱۹x ۱

اور اگر سورہ توبہ کی آخری دو آیات میں وارد شدہ ان الفاظ کو ملا لیا جائے تو ہر ایک میں ایک ایک عدد بڑھ جاتا ہے اور پھر (۱۹) سے تقسیم نہیں ہوتا۔

قرآن کریم میں اس طرح کی دقیق رعایتوں کا سراغ دوسرے لوگوں نے بھی لگایا ہے۔ مثلاً علامہ زمخشری نے اپنی تفسیر میں سورہ بقرہ کے حروف مقطعات (الم) پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ۲۹ سورتوں کے شروع میں حروف تہجی کے نصف یعنی (۱۴) حروف مقطعات ذکر کئے گئے ہیں اور ان میں بھی یہ رعایت ہے کہ حروف کی قسموں، مہموسہ، مجہورہ، شدیدہ، رخوہ، مطبقہ، منفتحہ، مستعلیہ، منخفضہ اور قلقلہ ان میں سے ہر قسم کے تحت جتنے حروف آتے ہیں اس کے نصف حروف مقطعات میں لئے گئے ہیں۔ اس طرح نصف نصف کی رعایت بھی اعجاز کی ایک صورت ہے۔

مولانا اسعد میاں

مولانا اسعد میاں میرے مکہ مکرمہ میں قیام کے دوران کئی بار یہاں تشریف لائے۔ ایک مرتبہ میں نے انہیں چند احباب کے ساتھ ناشتے پر مدعو بھی کیا۔ گھر میں ٹی۔وی سیٹ دیکھ کر فرمایا: آپ حضرات نے اسے کب سے جائز کر لیا؟

اگر پروگراموں کے بجائے مطلقاً ٹی۔وی سیٹ پر حرمت کا حکم لگایا جائے تو نہ معلوم ایسے حضرات ہوائی اڈوں کے ان ٹی۔وی سیٹوں پر کیا حکم لگائیں گے جن میں ہوائی جہازوں کی آمد ورفت کے پروگرام بتائے جاتے ہیں۔

اسعد میاں جمعیت علمائے ہند کے صدر بھی ہیں۔ میں نے اپنے دارالعلوم دیوبند کے ہم درس اور دوست مولانا افضال الحق صاحب گوہر قاسمی سے، جو حج کے لئے تشریف لائے ہوئے تھے، دریافت کیا کہ آپ نے تو برسوں اسعد میاں کے ساتھ جمعیت میں کام کیا ہے، بتائیے کہ کیا اسعد میاں میں اپنے والد حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی جیسا تقویٰ اور خلوص بھی ہے؟ خاموش ہو گئے۔

جن دنوں میں دیوبند میں زیرِ تعلیم تھا، اسعد میاں اس وقت چھوٹے تھے۔ اب اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی سیاسی سوجھ بوجھ اچھی ہے اور کیوں نہ ہو، انہوں نے تو سیاست کی گود ہی میں پرورش پائی ہے۔ یہ سیاسی سوجھ بوجھ ہی کا نتیجہ تھا کہ دارالعلوم کے اہتمام کے جھگڑے میں انہوں نے اپنے حریف مولوی سالم صاحب کو پچھاڑ دیا اور بیٹے کی طرف داری میں قاری طیب صاحب کو بھی اہتمام سے علیحدہ ہونا پڑا۔ میرے خیال میں یہ جھگڑا اسعد میاں اور مولوی سالم صاحب کا ذاتی جھگڑا تھا جو بچپن سے ایک دوسرے کے حریف چلے آرہے تھے۔

مولوی عبدالسّلام دہلوی

دہلی کے مولوی عبدالسّلام صاحب ایک مجذوب صفت بزرگ اور جید عالم تھے۔
میرے وطن سرونج کے مولانا عبید اللہ خان صاحب نے دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد کچھ عرصہ ان کے ساتھ بھی گذارا۔ مولانا عبید اللہ خان مرحوم نے مجھ سے بیان کیا کہ ان کے پاس رہتے ہوئے ان کے مصارف کا چارج میرے پاس تھا اور بکثرت ایسا ہوا کہ پیسوں کی ضرورت ہوئی تو فرمادیا کہ فلاں طاق میں سے لے لو اور مجھے اس طاق سے اتنے ہی پیسے مل جایا کرتے تھے جتنی ضرورت ہوتی تھی۔

غالباً مولانا عبید اللہ خان ہی نے بیان کیا کہ ایک مرتبہ مولوی عبدالسّلام صاحب ایک نکاح کی تقریب میں شریک ہوئے اور چھوہارے تقسیم کرنے کا کام ان کے سپرد کیا گیا۔ انہوں نے دریافت کیا کہ خدائی بانٹ بانٹوں یا انسانی؟ کہا گیا کہ خدائی بانٹ سے بہتر کیا ہو گی۔ انہوں نے ایک شخص کو دو تین چھوہارے دیئے دوسرے کو ایک مٹھی، تیسرے کو دو مٹھی اور باقی سب چھوہارے چوتھے شخص کو دے دئے۔ باقیماندہ سب لوگ محروم رہ گئے۔ پوچھا گیا: مولوی صاحب یہ کیا؟ جواب دیا: خدائی بانٹ تو ایسی ہی ہوتی ہے۔

مولانا تمنّا عمادی

مولانا تمنّا عمادی کو میں نے اس وقت دیکھا ہے جب ان کا سفینۂ حیات ساحل کے قریب پہنچ چکا تھا۔ بلخی صاحب مرحوم کے ساتھ پہنچا تھا۔ چشمے پر چشمہ چڑھائے گٹھری بنے گاؤ تکیہ سے ٹکے کچھ لکھ رہے تھے۔

بلخی صاحب مرحوم نے بتایا تھا کہ ناشتے میں خشخاش بھری ایک ٹکیہ اور شہد ان کا برسوں کا معمول ہے۔ اس لحاظ سے بینائی اتنی کمزور نہ ہونی چاہیئے تھی لیکن جب انسان گھوڑے پر ہاتھی کا بوجھ لاد دے تو وہ بھی کیا کرے۔

ایک صاحب کے خاندان میں جو نام رکھے جاتے تھے ان کا مادہ "ف، ض، ل" ہوتا تھا۔ "فاضل، افضل وغیرہ"۔ ان کے یہاں ایک بچی پیدا ہوئی تو تمنا صاحب سے درخواست کی کہ اسی مادہ سے کوئی مناسب نام تجویز کر دیں۔ انہوں نے خاندان کے دوسرے بچے بچیوں کے نام پوچھے۔ پھر فرمایا کہ اس مادہ کے سارے نام تو ہو چکے ہیں اب تو "فضلیٰ" کے سوا اور کوئی نام ذہن میں نہیں آتا۔

"فضلیٰ" اور "افضل" دونوں کے معنی ایک ہیں۔ فرق ہے تو یہ کہ افضل مذکر کے لئے ہے اور فضلیٰ مونث کے لئے۔ لیکن یائے مقصورہ کے بجائے اگر "ہ" تصور کر لی جائے تو کیا معنی ہو جاتے ہیں؟ اور گفتگو میں "ی" اور "ہ" کا کیا تمیز ہوتا ہے۔

قاری فتح محمد صاحب مرحوم

قاری فتح محمد صاحب رحمتہ اللہ علیہ جو استاد القراء تھے اور قرأت عشرہ میں مہارت رکھتے تھے اور جن کی بیداری کا بیشتر وقت قرآن کریم کے پڑھنے یا سننے میں گذرتا تھا، انہیں ۲۰۔ مئی ۱۹۷۹ء میں لاہور میں فالج ہوا جبکہ وہ مدینہ منورہ سے کچھ دن کے لئے پاکستان گئے ہوئے تھے۔ فالج ہی کی حالت میں مدینہ منورہ واپس آگئے ایک حافظ صاحب انہیں اپنی پیٹھ پر لاد کر مسجدِ نبوی لاتے اور لے جاتے تھے اور انہیں قرآن کریم سناتے رہتے تھے۔

۱۷ اور ۱۸۔ شعبان ۱۴۰۷ھ کی درمیانی شب میں تین پینتیس پر ان کا انتقال ہوا اور ۱۸۔ شعبان بروز پنجشنبہ (۱۶۔ اپریل ۱۹۸۷ء) بعد ظہر حرم نبوی کے امام علی الحذیفی نے جنازے کی نماز پڑھائی اور بقیع میں دفن ہوئے۔ امام مالکؒ اور امام نافعؒ کی قبور سے قبلے کی جانب نویں قبر ہے۔

مولانا عابد شبّر صاحب

کراچی یونیورسٹی میں ہمارے رفیق کار مولانا عابد شبّر صاحب نے بیان کیا کہ میں نے حج کے لئے درخواست دی اور بعد میں اپنی بیوی کی درخواست بھی داخل کر دی۔ قرعہ میں میرا نام تو آگیا، بیوی کا نام نہ آیا۔ ہم دونوں کلفٹن پر عبداللہ شاہ صاحب کے مزار پر گئے۔ بیوی نے منت مانی، نیچے اترے تو سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے ایک ملنگ نے کہا: تو نے حج کی منت مانی ہے، تو ضرور جائے گی۔ بیوی نے کہا کہ قرعہ میں تو میرا نام آیا نہیں۔ کہنے لگا: کہہ دیا کہ ضرور جائے گی، نہ جائے تو میرے منہ پر تھوک دینا اور یہی ہوا کہ اسباب خود بخود اس طرح کے پیدا ہو گئے کہ اس سال بیوی میرے ساتھ حج کو آئیں۔

یہ شیعہ حضرات بھی عجیب ہوتے ہیں۔ کوئی سنّی بزرگ زندہ ہو تو خاطر میں نہیں لاتے، مر جائے تو شیعہ سنی کی تفریق کے بغیر منتیں مانتے اور چادریں چڑھاتے ہیں مگر زندوں کے مقابلے میں جنہیں مُردوں سے زیادہ تعلق ہو ان کے لئے یہ بات قابلِ تعجب بھی نہیں۔

ڈاکٹر عابد علی خاں صاحب

کراچی یونیورسٹی کے شعبہ فارسی کے پروفیسر ڈاکٹر عابد علی خاں صاحب مراد آبادی میرے ان رفقائے کار میں ہیں جنہیں میں اپنے بزرگوں کی فہرست میں شمار کرتا ہوں ۔ بزرگوں کی اولاد ہیں اور خود بھی بزرگ ہیں ۔ ان کے دادا حاجی مظفر علی خاں صاحب اور پردادا حاجی گوہر علی خاں صاحب معروف بزرگوں میں سے ہیں ۔

شیخ سعدی نے یہ جو کہا ہے "آثار بزرگی در عہدِ طفلی از جبینش ہویدا" (بچپن کے زمانے ہی سے بزرگی کے آثار اس کی پیشانی سے ظاہر ہوتے تھے) ڈاکٹر صاحب پورے طور پر اس کا مصداق ہیں ۔ موروثی اثرات تو تھے ہی، بچپن ہی سے مولانا غالب علی صاحب کے فیض صحبت نے انہیں جلا دے کر مزید پروان چڑھایا ۔

ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ میں دس گیارہ سال کی عمر ہی میں مردوں کو قبروں میں قرآن پاک کی تلاوت کرتے دیکھ لیا کرتا تھا ۔ ایک مرتبہ میں نے "گپو" کو دیکھا کہ وہ قبر سے نکلا اور میں نماز میں شامل ہوا تو میرے برابر آکر کھڑا ہو گیا ۔ نماز سے فارغ ہو کر میں نے اسے واپس جاتے دیکھا، اپنی قبر پر کھڑا ہوا اور پھر قبر میں غائب ہو گیا ۔

فرمایا کہ بچپن میں میرے خواب بسا اوقات سچے ہوتے تھے ۔ جیسا دیکھتا تھا ویسا ہی وقوع میں آجاتا تھا اور جب بھی اس طرح کے خواب مولانا غالب علی صاحب سے بیان کرتا تھا، فرماتے تھے: بیٹا عابد خان، تم یہ بھی دیکھ لیا کرتے ہو!

مولانا غالب علی، مولانا محمد تھانوی کے اور وہ حضرت نور محمد جھنجھانوی کے خلیفہ تھے ۔ ڈاکٹر صاحب نے پہلی بیعت لڑکپن ہی میں مولانا غالب علی صاحب سے کی اور مدتوں ان سے فیض حاصل کیا، اسی لئے بکثرت ان کے کشف و کرامات کا ذکر کرتے ہیں ۔

مولانا غالب علی صاحب کے منہ سے بکثرت، حتی کے نماز تک میں، بے اختیار زور سے "اللہ" کا نعرہ نکل جایا کرتا تھا، اور ہم نے دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب کو بھی باتیں کرتے کرتے جھرجھری آتی ہے اور "اللہ" کا نعرہ ان کے منہ سے بھی بے اختیار نکل جاتا ہے۔

فرمایا کہ رُڑکی میں قاضی اسماعیل صاحب کے پوتے عبدالولی صاحب کی شادی کے موقع پر ان کے مخالفین نے انہیں شرمندہ کرنے کے لئے ان کو مطلع کئے بغیر بہت لوگوں کو مدعو کر لیا۔ کھانے کی قلت اور مہمانوں کی کثرت سے میزبان سخت پریشان تھے۔ مولانا غالب علی صاحب نے اپنا رومال دیگ پر ڈھانک دیا، اس میں سے کھانا نکالتے گئے اور سب نے سیر ہو کر کھایا۔ فرمایا کہ یہ میرے سامنے کا واقعہ ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے دادا پیر قاضی اسماعیل صاحب کا بھی یہ واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ ان کے ایک خلیفہ بنارس میں ایک دوکان پر بیٹھے تھے، سامنے سے ناگوں (وہ سادھو جو ننگے رہتے ہیں) کا جلوس گذرا، جن کا سردار ہاتھی پر سوار تھا۔ جونہی ہاتھی سامنے آیا ان کے دل میں خیال آیا کہ کیا ڈھونگ رچار کھا ہے۔ سردار فوراً ہاتھی سے اتر کر دوکان میں ان کے سامنے آکر بیٹھ گیا اور انہیں حکم دیا کہ آنکھیں بند کرو، انھوں نے آنکھیں بند کیں، سادھو نے بھی آنکھیں بند کر کے ان پر روحانی دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ وہ پسینہ پسینہ ہو گئے۔ فوراً انہوں نے اپنے پیر قاضی اسماعیل صاحب کا تصور کیا، سادھو نے اسی وقت آنکھیں کھول دیں اور یہ کہہ کر چل دیا کہ تیرا پیر بڑا زبردست ہے، تیرا پیر بڑا زبردست ہے۔ بعد میں وہ خلیفہ قاضی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو فرمایا کہ اگر تم میرا تصور نہ کرتے تو وہ تمہیں ہندو بنا کر چھوڑتا۔

دل کی دنیا کا حال بھی عجیب ہے۔ یہ مادی دنیا کی محبتوں اور نفرتوں کی آماجگاہ بھی ہے، روحانی دنیا کے عجائبات کا محور بھی ہے اور اللہ عزوجل کے انوار و تجلیات کا مرکز بھی۔ تاریک ہو تو انسان شیطان بن جائے، روشن ہو جائے تو نہ صرف جبروت

بلکہ ملکوت ولاھوت وھاھوت کی خبر لائے۔

جس طرح جسمانی ورزش جسم کو قوی کرتی ہے، روحانی ریاضت قلب کی نورانیت کا سبب بنتی ہے۔ اس میں مومن و کافر کی کوئی تخصیص نہیں۔ اسی لئے سادھو نے ان کے دل کا حال معلوم کر لیا۔

صوفیاء کہتے ہیں: "طرق الوصول إلى الله بعدد أنفاس الخلائق (اللہ تک رسائی کے راستے تعداد میں مخلوقات کی سانسوں کے برابر ہیں)۔ فرق صرف یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سے قیامت تک کے لئے اللہ تک رسائی کا منظور شدہ سرکاری راستہ صرف اسلام کا راستہ ہے۔ گویا اخروی نجات کے لئے اب صرف One way trafic ہے۔ جو بھی اس کی خلاف ورزی کرے گا چالان اور سزا سے نہ بچ سکے گا۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝

"اور جو کوئی اسلام کے سوا کوئی اور دین چاہے تو وہ اس سے ہرگز قبول نہ ہوگا اور وہ (شخص) آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔"

خلاف پیمبر کسے رہ گزید کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

(پیغمبر کے خلاف جس نے جو راہ بھی اختیار کی وہ منزل (مقصود) تک ہرگز نہ پہنچے گا)

ڈاکٹر صاحب بعد میں حضرت شاہ زوّار حسین صاحب مرحوم سے بیعت ہو گئے تھے۔ فرمایا کہ ایک مرتبہ حضرت شاہ صاحب کراچی سے واپس تشریف لے جا رہے تھے، ریل میں سوار ہو چکے تھے، رخصت کرنے والوں میں اسٹیشن پر میں بھی موجود تھا۔ میرے دل میں خیال آیا کہ اس مرتبہ حضرت نے میرا سبق نہیں بڑھایا۔ فوراً شاہ صاحب نے صوفی محمد احمد صاحب مرحوم کو مخاطب کر کے فرمایا: صوفی صاحب! بن

مانگے موتی ملیں اور مانگے ملے نہ بھیک " پھر فرمایا: صوفی صاحب! عابد صاحب کا سبق پڑھا دینا۔

کسی بزرگ سے اگر جنات کا تعلق ہو تو ان کا یہ تعلق دوستانہ یا منتقمانہ صورت میں ان کی اولاد تک سے قائم رہتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے پردادا حاجی گوہر علی صاحب جنات کو بوتلوں میں بند کر دیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے بیان کیا کہ کبھی کبھی جنات میری والدہ کو بھی ستایا کرتے تھے۔ میری خالہ بعض اوقات آدھی رات کو حویلی کی چھت پر بڑے بڑے پتھر پھینکنے کی آواز سنتیں اور تنگ آکر کہتیں کہ چچا میاں اب تو رحم کرو۔ وہ آواز بند ہو جاتی۔

کبھی ایسا بھی ہوا کہ سردیوں کی راتوں میں والد صاحب دیر سے گھر آئے اور دروازہ کھٹکھٹایا تو کنڈی خود بخود کھل گئی اور وہ اندر آگئے۔ خود ڈاکٹر صاحب کا پیچھا جنات نے اب تک نہیں چھوڑا۔ فرمایا کہ گلشن اقبال کے جس مکان میں رہا کرتا تھا اس میں دوسرے غیر معمولی حالات کے ساتھ ایک مرتبہ میں نے دیکھا کہ ایک بچہ کمرے میں آیا اور میرے پلنگ کے نیچے گھس گیا، میں نے جھک کر دیکھا تو کچھ بھی نہ تھا۔

فرمایا کہ کراچی یونیورسٹی کیمپس کے B-2 کے جس کمرے میں میری رہائش تھی، ہمیشہ دن کے ٹھیک بارہ بجے ایک بار چوڑیوں کی کھنک سنائی دیتی تھی۔ یہ آواز بارہا میری بیوی نے بھی سنی۔

فرمایا کہ اب بھی گلستان جوہر کے اس مکان میں بکثرت ایسا ہوتا ہے کہ میں تسبیح وغیرہ کوئی چیز ایک جگہ رکھتا ہوں اور وہاں سے غائب ہو جاتی ہے، پھر دیکھتا ہوں تو اسی جگہ مل جاتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے بیان کیا کہ مراد آباد میں ایک بہت بڑا گھر "انگور والا گھر" کے نام سے معروف تھا۔ اس گھر میں اتنے افراد رہتے تھے کہ تیس سیر آٹے کی روٹیاں ایک

وقت میں پکتی تھیں ۔ اس گھر کی ایک بی بی نے اپنی باندی سے رات کے وقت کہا کہ بیت الخلا میں، جو فاصلہ پر تھا، پانی کا لوٹا رکھ آ ۔ پھر اس کے ساتھ بیت الخلاء کے لئے نکلیں تو باندی سے کہا کہ تو نے لالٹین تو لی ہی نہیں ۔ باندی نے اپنی انگلی پر پھونک ماری، وہ چراغ کی طرح روشن ہو گئی ۔ گویا وہ کوئی بدروح تھی، جس نے ان کی باندی کی شکل اختیار کر لی تھی ۔

فرمایا: مراد آباد میں ایک مجذوب لڑکی تھی ۔ وہ "لا کنّی" کہہ کر ایک آنہ مانگا کرتی تھی ۔ جہاں بیٹھتی تھی کتے اور کوے اس کے گرد ہوتے تھے اور حلوہ پوری مٹھائی وغیرہ کھایا کرتے تھے ۔ جس کتے سے ناراض ہوتی اسے پکڑ کر اس کے حلق تک اپنا ہاتھ ڈال دیا کرتی تھی ۔ کسی تانگے کو ٹھہرنے کا اشارہ کرتی اور وہ نہ رکتا تو اسے پیچھے سے پکڑ لیتی، تانگہ سرک بھی نہ سکتا تھا ۔

فرمایا: سانپ دیکھ کر "**أَسكَيتُ**" کہہ دیا جائے تو اگر وہ جن ہے تو فوراً ٹھہر جاتا ہے اور کتا دیکھ کر اگر "**مِنْ قِطْمِيْرْ**" کہہ دیا جائے تو بھاگ جاتا ہے ۔

فرمایا: میں ۱۹۳۶ء تک چشمہ لگاتا تھا ۔ میں نے ہر فرض نماز کے بعد گیارہ بار "**یانور**" پھر تین بار "**فكشفنا عنك غطائك فبصرك اليوم حديد**" (پھر ہم نے تیرا پردہ ہٹا دیا چنانچہ آج تیری بینائی تیز ہے) پڑھ کر دونوں ہاتھوں کی پہلی انگلیوں پر دم کر کے دونوں آنکھوں پر پھیرنا شروع کر دیا تو کچھ عرصے بعد میرا چشمہ چھوٹ گیا ۔ ڈاکٹر صاحب کی عمر اس وقت (۱۹۹۶ء) اسی (۸۰) کے قریب ہے اور وہ چشمے کے بغیر اخبار پڑھ لیتے ہیں ۔

ڈاکٹر صاحب کو بزرگوں، مجذوبوں اور جنات وغیرہ کے اتنے واقعات ہیں کہ اگر انہیں مرتب کر لیا جائے تو ایک کتاب بن جائے ۔ بیٹھتے ہیں تو گھنٹوں اس طرح کے واقعات سناتے جاتے ہیں، لیکن جہاں تک لکھنے کا تعلق ہے "پر طبیعت ادھر نہیں آتی" ۔

ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی صاحب

کراچی یونیورسٹی کے شعبہ، اردو کے پروفیسر ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی صاحب علمی اور ادبی حلقوں کی ایک معروف شخصیت ہیں، لیکن ان کی شخصیت کا ایک رخ اور بھی ہے ۔ میں نے کوشش کی ہے کہ ان کے اس نسبتہً غیر معروف رخ کی کچھ جھلکیاں پیش کروں ۔

" کشفی " ان کے نام کا جز ہے، جسے انہوں نے تخلص کے طور پر بھی اختیار کر لیا ہے ۔ پیدائش ہی سے ان کے نام کا یہ لاحقہ شاید قدرتی اشارہ تھا ان کی اس کشفی حالت کی طرف، جس کے شواہد ان کی زندگی میں بکثرت ملتے ہیں اور ان میں موروثی اثرات کا بھی بڑا دخل ہے ۔

کشفی صاحب کے جدامجد حضرت شاہ غلام رسول، رسول نما کے بارے میں تواتر کے ساتھ یہ ثابت ہے کہ وہ ہر جمعہ کو نماز کے بعد اپنے کاندھے پر پڑا رومال کسی نمازی کے سر پر ڈال دیتے اور وہ بیداری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کر لیتا ۔ حضرت شاہ رسول نما کا مزار اب تک مرجع خلائق ہے ۔

کشفی صاحب کہتے ہیں کہ میرا میٹرک کا امتحان ہو رہا تھا، مجھے اور لوگوں کو یقین تھا کہ اگر ریاضی میں پاس ہو گیا تو امتیازی کامیابی یقینی ہے ۔ میں امتحان کے لئے جانے سے پہلے فاتحہ پڑھنے مزار پر حاضر ہوا اور میں نے کہا کہ ہر بات اللہ کے اختیار میں ہے، آپ سے کچھ مانگنے نہیں آیا، ہاں اگر آپ روحانی طور پر زندہ ہیں تو اپنے رب سے میری کامیابی کی دعا کیجئے ۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ کوئی کان میں کہہ رہا ہے کہ جیومیٹری کی تیرھویں اور انتیسویں تھیورمیں اور الجبرا کا فلاں فارمولا (جو انہیں یاد نہیں رہا) یاد کر لو ۔ میں یاد کرتا ہوا امتحان گاہ پہنچا ۔ جب پرچہ ملا تو ساری چیزیں پرچے

میں موجود تھیں۔

کشفی صاحب نے بیان کیا کہ حضرت شاہ رسول نما کے مزار کے سرہانے ہار سنگھار کا ایک بڑا درخت تھا جس کی شاخیں چھت تک پہنچتی تھیں۔ چھت تک مسجد کی سیڑھیوں کے ذریعہ پہنچا جاسکتا تھا۔ ایک بار رمضان المبارک میں دیکھا کہ چھوٹے بھائی ابوالحسنات حقی غائب ہیں۔ ابھی سحری کا وقت باقی تھا۔ تلاوت شروع ہو گئی۔ میں آوازیں دیتا ہوا مسجد میں پہنچا۔ کسی نے کہا اوپر جا کر دیکھو۔ چھت پر پہنچا تو دیکھا کہ یہ کھڑے کانپ رہے ہیں اور دامن ہار سنگھار کے پھولوں سے بھرا ہوا ہے اور بہت سے پھول قدموں میں پڑے ہیں، حالانکہ درخت پر ایک پھول بھی نظر نہ آیا۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ ہزاروں پھول درخت سے ابوالحسنات کے دامن اور قدموں تک کیسے پہنچے۔ بہت سے پھول میں نے اپنے دامن میں بھرے اور ہم دونوں بھائی گھر چلے آئے۔ ابوالحسنات نے بتایا کہ میں نے سوچا کہ امی اور پھوپھیوں کے دوپٹوں کو رنگنے کے لئے ہار سنگھار کے پھول توڑ لوں، اوپر پہنچا تو نہ جانے کیسے قدم لڑکھڑائے اور میں نیچے گرنے لگا۔ کسی نے روک لیا اور اوپر کھڑا کر دیا اور یہ سارے پھول مجھ تک پہنچنے لگے۔

کشفی صاحب نے بیان کیا کہ میں عشاء کی نماز خاصی تاخیر سے مسجد میں ادا کرتا تھا۔ بارہ بجے کے بعد گرمیوں میں، مسجد کے صحن میں لوگ سوتے تھے۔ میں اندر مسقف حصہ میں چلا جاتا تھا۔ ایک رات فرض نماز کا سلام پھیرا تو دیکھا کہ کئی بلند و بالا لوگ سفید کپڑوں میں نماز پڑھ رہے ہیں۔ ان میں سے ایک صاحب نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور کہا کہ ہمارا راز کسی کو نہ بتانا، ہم حضرت شاہ غلام رسول اور حضرت شاہ احسان الحق کے زمانے سے یہاں مقیم ہیں۔ ہم میں سے کچھ نے دونوں کو دیکھا ہے اور کچھ نے صرف شاہ احسان الحق یا تمہارے دادا شاہ محمد اکبر کو۔ اجنّہ بھی تمہاری طرح جیتے اور مرتے ہیں، مگر ہماری عمریں عام طور پر ڈیڑھ دو سو سال ہوتی ہیں۔

کشفی صاحب کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں نے تاخیر سے نماز پڑھنا ختم کر دیا اور

جماعت سے نماز پڑھنے لگا۔ کہتے ہیں کہ اب بھی جب اس واقعہ کا تصور کرتا ہوں، رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

کشفی صاحب کی زندگی میں خواب خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے بیان کیا کہ رمضان ۱۴۱۵ھ کو میں مدینہ منورہ پہنچا۔ میرے بیٹے ابو احمد عاکف وہاں ڈپٹی ڈائرکٹر جج تھے۔ طے ہوا کہ ہم سب (بیوی اور بچیاں) حج کے بعد واپس ہوں گے۔ میں نے کہا اگر اجازت مل گئی۔ ہم لوگ قیام میں توسیع کے لئے درخواستیں دیتے رہے اور پندرہ پندرہ دن کی توسیع ملتی رہی اور ہم فی پاسپورٹ سو ریال دیتے رہے دو یا تین توسیعات کے بعد کہا گیا کہ مزید توسیع ممکن نہیں۔ ہم نے اللہ کا نام لے کر درخواست دے دی۔ ایک صبح سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ آپ ایک آرام کرسی پر تشریف فرما ہیں۔ آپؐ کے دستِ مبارک میں کاغذ اور قلم ہے۔ آپؐ کے سامنے میں کھڑا ہوں۔ آپؐ میری طرف دیکھ کر تبسم فرما رہے ہیں اور میرے دل کو یقین ہے کہ آپ میرے ہی لئے کچھ تحریر فرمائیں گے۔ میں خواب ہی میں درود و سلام پڑھتا رہا۔ تقریباً دو گھنٹے بعد گھنٹی بجی۔ دروازہ کھولا تو نعیم حامد علی کھڑے تھے۔ پاسپورٹ ان کے ہاتھ میں تھے۔ انہوں نے کہا: مبارک ہو۔

کشفی صاحب نے تقریباً دس گیارہ سال کی عمر میں بھی ایک خواب دیکھا تھا کہ پورے شہر میں پوسٹر لگے ہوئے ہیں کہ سید ابو الخیر کشفی اور شیطان کی کشتی ہو گی۔ عظیم الشان دنگل، کشتی کے دن ایسا ازدحام تھا کہ بیان کرنا مشکل۔ کشتی شروع ہوئی، کبھی ان کا پلہ بھاری ہوتا کبھی شیطان کا۔ ایک مرحلے پر شیطان نے ان کا گلا گھونٹنا شروع کیا۔ انہیں خیال آیا کہ یہ ان کی زندگی کا آخری دن ہے۔ انھوں نے سورہ اخلاص کی تلاوت شروع کی تو شیطان نے انہیں چھوڑ دیا، انھوں نے پھر سورہ اخلاص کی تلاوت کی تو شیطان کانپنے لگا اور تیسری بار تلاوت کرنے پر دھواں بن کر ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ مجمع نے انہیں کاندھوں پر اٹھالیا اور شہر میں جلوس کی صورت میں گشت

کیا۔

ایک مرتبہ کشفی صاحب نے مولانا عبدالرشید صاحب نعمانی کی مرحومہ بہن رحیمی کو خواب میں دیکھا کہ ان کی قبر میں چالیس چراغ ہیں۔صرف ایک چراغ بجھا ہوا ہے، باقی سب روشن ہیں۔ معلوم ہوا کہ مرحومہ نے چالیس بچیوں کو قرآن پڑھایا تھا، ان میں سے ایک لڑکی قادیانی تھی۔

کشفی صاحب نے اپنی عالم بیداری کا ایک حیرت انگیز واقعہ مجھے یہ کہہ کر سنایا کہ یہ واقعہ آج تک میری زبان پر نہیں آیا، پہلی بار تحدیث نعمت کے طور پر آپ کے سامنے ذکر کر رہا ہوں۔فرمایا: مسجد نبوی کی موجودہ توسیع سے پہلے بھی عورتوں کے لئے ایک حصہ مخصوص تھا۔بلقیس (ان کی اہلیہ) اسی حصے میں بیٹھتی تھیں۔ایک دن میں صفہ (اصحابِ صفہ کی نشست گاہ) پر بیٹھا تھا کہ آواز سنائی دی: "آیئے آیئے صحن میں آیئے"۔میں نے دیکھا کہ صفہ کے بعد جہاں سے صحن کا آغاز ہوتا ہے وہاں بلقیس کھڑی ہیں اور صرف اتنے حصے میں بارش ہو رہی ہے، سورج بھی چمک رہا ہے۔میں فوراً ان کے پاس پہنچا اور ہم دونوں کھڑے بھیگتے رہے۔اس عالم سرشاری اور لمحہ انعام میں یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ وہ اس حصہ میں کیسے پہنچ گئیں جو عورتوں کے لئے ممنوع تھا اور یہ کیسے ہوا کہ وہاں صرف ہم دونوں ہیں اور وہ بارش کیا اور کیسی تھی؟ یہ بات آج تک سمجھ میں نہ آسکی۔اس بارش میں بلقیس کی جرابیں بھیگ گئی تھیں، انہوں نے ان جرابوں کو احتیاط سے رکھ لیا۔ہماری چھوٹی بیٹی ام ابیہا سلما کے پیروں میں ان دنوں شدید درد ہوتا تھا اور کسی علاج سے کوئی فائدہ نہ تھا۔واپسی پر ہم نے وہ جرابیں بیٹی کو پہنائیں اور اس کے بعد سے کبھی درد نہ ہوا۔

کشفی صاحب نے اپنے چند خاندانی اوراد و وظائف کا بھی ذکر کیا۔

۱۔ اگر کسی عزیز کا انتظار ہے اور آنے میں تاخیر ہو رہی ہے یا کوئی چیز گم ہو گئی ہے تو سورۃ والضحیٰ پڑھ کر تین مرتبہ دستک دیجئے۔انشاء اللہ وہ شخص آجائے گا اور وہ چیز مل

جائے گی۔

۲۔ آنکھوں کی روشنی برقرار رکھنے کے لئے یہ مفید ہے کہ نماز عصر کے بعد سورۃ النبأ کی تلاوت کی جائے اور اسی طرح مغرب کے بعد دو رکعت نفل پڑھے جائیں اور دونوں رکعتوں میں تین تین بار سورۃ الکوثر پڑھی جائے۔

۳۔ جو بچے ہکلاتے ہیں ان پر سورۃ الرحمن کی پہلی چار آیات اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا " **واحلل عقدۃ من لسانی** " پڑھ کر دم کیا جائے (اوّل و آخر درود شریف کے ساتھ) اور ہو سکے تو ان سے پڑھوائی جائیں۔ انشاء اللہ مرض ختم ہو جائے گا

کشفی صاحب نے یہ بھی بتایا کہ اگر سانپ دیکھ کر " **إنهم يكيدون كيداً وأكيد كيداً** " پڑھ دیا جائے تو سانپ وہیں ٹھہر جاتا ہے اور اگر پوری آیت " **فمهل الكافرين أمهلهم رويداً** " پڑھ دی جائے تو بھاگ جاتا ہے۔

ڈاکٹر محمد صابر صاحب

کراچی یونیورسٹی کے شعبہ، تاریخ اسلام کے پروفیسر ڈاکٹر محمد صابر الہ آبادی سے میرا رفاقت کا تعلق بھی رہا اور ہمسائیگی کا بھی۔ ڈاکٹر صاحب ایک ذہین، خوش طبع، حاضر جواب اور مرنجان مرنج انسان ہیں۔ اپنے کراچی یونیورسٹی کے رفقائے کار میں سے مولانا سراج احمد صاحب مرحوم کے سوا، جو میرے بچپن کے ساتھی تھے، میں کسی اور سے اتنا بے تکلف نہیں رہا جتنی بے تکلفی مجھے ڈاکٹر صابر سے تھی اور ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے ایک عبرت انگیز قصہ یہ سنایا کہ سلطان بایزید اوّل نے بورصہ میں ایک مسجد "جامع سلطان" بنوائی۔ تعمیر کے بعد شیخ الاسلام اور انجینئر کو لے کر معائنے کے لیے گئے۔ شیخ الاسلام نے مسجد کی خوبصورتی کی تعریف کی، لیکن کہا کہ اس میں ایک خامی رہ گئی۔ انجنیئر کانپ گیا۔ سلطان نے دریافت کیا: وہ کیا؟ جواب دیا کہ اس میں انجنیئر نے سلطان کی شراب نوشی کے لئے کوئی کمرہ نہیں بنایا۔ سلطان نے اسی روز سے شراب نوشی ترک کر دی۔

ناظم ظہیر الدین صاحب مرحوم

میں جس زمانے میں ٹونک کی عدالت شرع شریف میں مفتی تھا، میں نے خود بعض ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جو یکمشت و دو انگشت کی ڈاڑھیاں رکھے عدالت کے باہر موجود رہتے تھے اور دو دو روپے میں جھوٹی شہادتیں دیتے تھے ۔ یہ اس لئے کہ اس عدالت میں کسی شاہد کی شہادت اس وقت تک قبول نہ ہوتی تھی جب تک اس کا چہرہ کم از کم یکمشت ڈاڑھی سے آراستہ نہ ہو ۔

اس عدالت کے ایک ناظم ظہیر الدین صاحب کا واقعہ ہے کہ کسی نے عدالت شریعت میں مقدمہ دائر کیا اور شہادت میں نواب سعادت علی خان کو لکھوا دیا ۔ سمن جاری ہو گیا اور نواب صاحب کو عدالت میں حاضر ہونا پڑا ۔ نواب صاحب آکر اسی فرش پر جہاں گواہ بیٹھتے تھے، بیٹھے تو ناظم صاحب نے نظر اٹھائے بغیر دریافت کیا: گواہ کا نام؟ جواب: سعادت علی خان ۔ باپ کا نام؟ جواب: نواب ابراھیم علی خان ۔ نواب کیا ہوتا ہے، سیدھا نام بتاؤ ۔ جواب: ابراھیم علی خان ۔ ناظم صاحب نے اسی طرح نظر اٹھائے بغیر پیشکار سے کہا کہ دیکھو گواہ کے چہرہ پر ڈاڑھی ہے یا نہیں ۔ پیشکار نے جواب دیا: نہیں ۔ ناظم صاحب نے پیشکار سے فرمایا کہ گواہ سے کہہ دو کہ ڈاڑھی منڈانے کی وجہ سے وہ فاسق ہے اور فاسق کی شہادت شرعاً معتبر نہیں، اس لئے وہ جا سکتا ہے ۔ نواب صاحب نے یہ سن کر جواب دیا: "ناظم صاحب شریعت کا حکم سر آنکھوں پر، میں جاتا ہوں" اور اٹھ کر چلے آئے ۔ جب شریعت کی روح کو نظر انداز کر کے اس کی صرف لفظی تعمیل کی جائے تو اسی طرح کے واقعات سامنے آتے ہیں ۔

ناظم صاحب قائم اللیل اور صائم النہار بزرگ تھے ۔ اس زمانے میں ایک روپے کی تیس روٹیاں آتی تھیں ۔ افطار کے لئے ایک روپے کی روٹیاں منگواتے، ۲۹

تقسیم کر دیتے اور خود ایک روٹی پر اکتفا کرتے۔

ناظم صاحب طبیب بھی تھے اور اتنے حاذق کہ قارورہ دیکھ کر بتا دیا کرتے تھے کہ اتنے ماہ کا حمل ہے۔

ناظم صاحب میں ایک بری عادت یہ تھی کہ عدالت میں بیٹھے ہوئے بھی ان کے منہ سے بے اختیار لفظ "سالا" نکل جایا کرتا تھا۔ایک مرتبہ نواب سعادت علی خان نے ان سے کہا: ناظم صاحب! سنا ہے آپ عدالت میں بھی گالیاں بکتے ہیں! جواب دیا: کون سالا کہتا ہے۔

حکیم سید محمود احمد برکاتی

اخلاص و مروت، عجز و انکسار اور محبت و صداقت کو اگر کوئی شخص مجسّم دیکھنا چاہتا ہو تو اس کے لئے حکیم سید محمود احمد صاحب برکاتی کو دیکھ لینا کافی ہو گا۔

اعلیٰ درجے کے علمی اور تحقیقی ذوق کے ساتھ ساتھ کریمانہ اخلاق کی جس بلندی پر وہ فائز ہیں، میں نے ایسے لوگ بہت کم دیکھے ہیں۔ میرے صفِ اوّل کے مخلص دوستوں کی مختصر سی فہرست میں برکاتی صاحب بھی شامل ہیں اور زیادہ صحیح یہ ہے کہ ان جیسے شخص نے مجھ جیسے شخص کو بھی اپنے دوستوں کی فہرست میں شامل کر رکھا ہے۔

بھٹو صاحب نے جب قادیانوں کو پارلیمنٹ سے کافر قرار دلوایا تو میں نے برکاتی صاحب سے اس کارنامے کی تعریف کی۔ کہنے لگے کہ یہ جماعت اسلامی کے دباؤ کا نتیجہ ہے۔ میں نے غصے سے کہا کہ آپ ہر اچھائی کو اپنی جماعت کی طرف منسوب کر لیتے ہیں۔ نہایت سنجیدگی سے کہنے لگے کہ آپ چونکہ کسی جماعت سے وابستہ نہیں اس لئے جو اچھائی یا برائی جس جماعت میں دیکھتے ہیں اسی کی طرف منسوب کر دیتے ہیں، لیکن جو شخص کسی جماعت سے وابستہ ہو اگر وہ ہر خوبی کو اپنے اور ہر خرابی کو مخالف کے پلّے میں نہ ڈالے تو اس کی جماعت پروان نہیں چڑھتی۔

اس زمانے میں برکاتی صاحب جماعت اسلامی سے وابستہ تھے۔

میری سعودی عربیہ کی ام القریٰ یونیورسٹی کی ملازمت کی بنیادی اینٹ کراچی کے ایس۔ ایم۔ کالج کی ملازمت ہے۔ اسی ملازمت سے ترقی کرکے میں سندھ یونیورسٹی، پھر کراچی یونیورسٹی اور اس کے بعد ام القریٰ یونیورسٹی میں پہنچا۔ اپنی کتاب "حیاتِ بقا" میں ایس۔ ایم۔ کالج کی ملازمت کے ضمن میں تفصیل کے ساتھ

لکھ چکا ہوں کہ میری یہ ملازمت اللہ کے فضل کے ساتھ ساتھ اسباب کی دنیا کی حد تک برکاتی صاحب کی مساعی کی مرہونِ منت ہے۔ اللہ انہیں دارین کی سعادتیں نصیب فرمائے۔

حکیم صاحب نے جب لیاقت آباد میں اپنا مطب کھولا تو وہ مجھے مفت دوا دیا کرتے تھے اور مجھے بھی تعلقات کی نوعیت کے اعتبار سے قیمت پوچھتے ہوئے شرم آتی تھی۔ ایک عرصے بعد بالآخر میں نے یہ شرم توڑ دی اور جب قیمت لینے پر بہت اصرار کیا تو لینے لگے، لیکن ہر بار میں جانتا تھا کہ یہ دوا کی قیمت نہیں صرف قیمت کا نام ہے۔

برکاتی صاحب ایک ذہین طبیب ہیں اور ان کے سینے اور سفینے میں بے شمار نسخے ہوں گے۔ ایک نسخہ جو انہوں نے مجھے کمر کے درد کے لئے بتایا وہ درج کر رہا ہوں۔ ہم وزن خشک ہڑ، بہیڑہ اور آملہ لے کر سب کو ملا کر کوٹ کر لیا جائے، پھر انہیں آٹھ گنا پانی میں بھگو کر چوبیس گھنٹے بعد پانی پھینک دیا جائے۔ اس طرح تین بار کیا جائے، چوتھے روز کا پانی نتھار کر کسی لوہے کی کڑھائی یا توے میں، جس میں زنگ بالکل نہ ہو (جیسے دودھ والوں کی کڑھائی ہوتی ہے)، تھوڑا تھوڑا پانی ڈال کر سارا پانی جلا لیا جائے۔ کڑھائی کی تہ میں جو نمک جما ہو اسے کھرچ لیا جائے اور اس میں سے ایک رتی نمک روزانہ کیپسول میں رکھ کر کھا لیا جائے۔ میں نے اس پر عمل کیا۔ ایک مرتبہ میں صرف پندرہ روز کی خوراک نکلی، لیکن پندرہ روز ہی میں کمر کا درد کافور ہو گیا اور بھوک اتنی بڑھ گئی کہ باید و شاید۔ یہ نمک بے انتہا تیز ہوتا ہے۔ کیپسول کے بغیر کھایا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سینے کی پوری نالی کٹ گئی۔ یہ نمک بینائی اور دماغ کے لئے بھی بہت مفید ہے۔

ایک سال کراچی میں آموں کے درختوں میں کیڑا لگ گیا اور پورے پورے درخت سیاہ ہو گئے۔ یونیورسٹی کیمپس میں بھی، جہاں میری رہائش تھی، لوگوں کے گھروں میں بکثرت درخت تھے۔ خود میرے مکان میں بھی اچھے قسم کے بڑے بڑے تین

آموں کے درخت تھے۔ یونیورسٹی میں حالانکہ نباتیات کا شعبہ ہے اور اس سے وابستہ متعدد اساتذہ کیمپس میں رہتے تھے، لیکن کوئی بھی درختوں کی اس بیماری کا علاج نہ کر سکا اور سب نے درخت کٹوا دیئے۔ ایک روز برکاتی صاحب مکان پر تشریف لائے، آموں کی یہ حالت دیکھ کر کہا کہ برمے سے ان درختوں کے تنے میں جڑ سے تقریباً ایک گز اوپر سوراخ کرو، اس طرح کہ برما تھوڑا سا نیچے کی طرف مائل ہوتے ہوئے تنے کے وسط تک پہنچ جائے، پھر ہر درخت کے سوراخ میں ایک تولہ پارہ ڈال کر نکلے ہوئے برادے کو سوراخ میں بھر کر اسے مٹی سے بند کر دو۔ میں نے یہ عمل کیا تو چند روز میں درختوں کی ساری سیاہی دور ہو گئی اور پھر کئی سال تک درخت صحیح حالت میں قائم رہے۔

برکاتی صاحب نے ایک مرتبہ یہ قصہ سنایا کہ نواب اسماعیل خان کے زمانے میں ٹونک کے ایک آل انڈیا مشاعرہ میں جوش صاحب بھی مدعو تھے۔ رات کو جب دونوں پینے پلانے بیٹھے تو سرور کے جوش میں جوش صاحب کی زبان سے نکلا: اسمعیل علی خان! اگر اس وقت نواب ابراھیم علی خان (نواب صاحب کے دادا) اور نواب محمد خان (جوش کے دادا) زندہ ہوتے اور ہمیں اس حال میں دیکھ لیتے تو لاتنے جوتے مارتے کہ گنے نہ جاتے۔ نواب اسمعیل علی خان نے کہا: جوش صاحب۔ دادا زندہ نہیں تو کیا ہوا، ایک زندہ، جاوید ہستی تو ہے جو ہمیں دیکھ رہی ہے اور ہر طرح کی سزا دینے پر قادر ہے۔ یہ کہہ کر اسی وقت جام توڑ دیا اور کہا: جوش صاحب! اس مرتبہ تو آپ کا جب تک ٹونک میں قیام ہے شراب ملے گی، لیکن آئندہ اس توقع پر نہ آئیے گا کہ آپ کو شراب مہیا کی جائے۔

ایک مایوس مریض نے برکاتی صاحب کے علاج سے شفا پا کر انہیں کیمیا کا نسخہ بتانا چاہا۔ برکاتی صاحب کی عالی ہمتی اور استغناء کہ سیکھنے سے انکار کر دیا، حالانکہ لوگ اس دھن میں عمریں گنواتے اور پیسے پھونکتے رہتے ہیں۔

برکاتی صاحب طبیب، عالم اور محقق ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر بھی ہیں۔ اپنے اشعار وہ صرف مخصوص احباب کے سامنے زبان پر لاتے ہیں۔ بعض متفرق اشعار حسب ذیل ہیں:

جھکی جھکی سی نگاہیں، رکے رکے سے نفس
لیا گیا ہے مرا کتنے اہتمام سے نام

ooo

گُلوں میں بھی رنگ اور خوشبو ہے لیکن
تمہارے بدن کی سی گرمی نہیں ہے

ooo

نظارہ کر رہا ہوں نئے رُخ سے آپ کا
خود آ گیا ہوں آج میں اپنے ہی روبرو

ooo

دل ابھی تک ہے مرے قابو میں
اور دو ایک شکن گیسو میں

ooo

سوچتا ہوں آج پہلی بار ان کو دیکھ کر
جانے کتنی بار دیکھا تھا یہ چہرہ خواب میں

ooo

اتفاقاً آپڑی تھی رُخ پہ زلف
کتنے افسانوں کا عنوان بن گئی

برکاتی صاحب نے بعض نعتیں بھی بہت نفیس کہی ہیں۔

جام صاحب

جام صاحب نواب سعادت علی خان کے استاد تھے اور ان کی غزلوں پر اصلاح دیا کرتے تھے اور زیادہ صحیح یہ ہے کہ نواب صاحب کے نام سے خود غزلیں کہا کرتے تھے۔ بڑے قادرالکلام شاعر تھے۔ پیشانی پر گٹا، ہر وقت ہاتھ میں تسبیح اور تہجد گذار۔ نواب صاحب کے تھیٹر کے لئے مکالے اور گانے لکھنا اور اداکاروں کو تیار کرنا یہ بھی ان کے فرائض میں داخل تھا۔ موصوف نے ایک ٹھمری لکھی اور اس میں ایک عام محاورے کو بڑی خوبصورتی سے الٹا۔ مشہور ہے "جو سویا سو کھویا"۔ جام صاحب نے جو ٹھمری لکھی پوری تو مجھے یاد نہیں، اس کا پس منظر یہ ہے کہ پہلی بیوی کے خوشامدیں کرنے اور پیر پڑنے کے باوجود شوہر نوبیاہتا بیوی کو لے کر پردیس چلا گیا۔ پہلی بیوی نے ایک روز خواب میں شوہر کو گھر میں آتے دیکھا تو لپکی، کہتے ہیں:

جب راج کے پیاں پرن برھی   من ہوک سے موری آنکھ کھلی
سب سوئے کے کھوئیں اے ری سکھی   میں جاگ کے واکھو کھوئے گئی۔

جام صاحب ہی کا ایک استادانہ شعر ہے۔ الفاظ کے تغیر و تبدل سے کیا کام لیا ہے۔

میں مر چکوں تو وہ آئیں یہ انتظار انہیں
وہ آچکیں تو مروں میں یہ انتظار مجھے

جام صاحب کے بعض اشعار حسبِ ذیل ہیں:

کاش اتنا تو بڑھے جذبِ جنونِ الفت
کوئی پتھر کہیں پھینکے مرے سر تک پہنچے

٥٥٥

شادابیِ چمن کو حسرت سے دیکھتا ہوں
انجام میں نظر نے بے کار کردیا ہے

ooo

یہ کیا کفرانِ نعمت کر رہا ہوں — ترے غم کی شکایت کر رہا ہوں
انہیں دیکھو وہ رخصت ہو رہے ہیں — مجھے دیکھو میں رخصت کر رہا ہوں

واصف ملک صاحب

انٹر اور بی ۔اے کے امتحانات کے سلسلے میں جب بھی میں لاہور گیا میں نے واصف ملک صاحب کی کلاسوں میں شرکت کی ۔ واصف ملک صاحب نے لاہور میں ایک کوچنگ سینٹر قائم کر رکھا تھا اور خاص طور پر امتحانات کے زمانے میں امتحانات کی تیاری کراتے تھے ۔ چہرہ ڈاڑھی اور مونچھوں سے بے نیاز اور بدن پر استری کیا ہوا بہترین بے داغ سوٹ ۔ انگریزی یا تو واقعتہً FLOWERY بولتے تھے یا پھر اس لئے FLOWERY معلوم ہوتی تھی کہ اس زمانے میں بلکہ اب تک میری انگریزی اور انگریزی ہی کیا ہر زبان و علم کی استعداد ناقص ہے ۔ ظاہر میں مسٹر تھے اور باطن میں صوفی و ملا ۔ ملائیت کی قدرِ مشترک نے انہیں مجھ سے زیادہ مانوس کر دیا تھا ۔

انٹر کے پرچوں سے فارغ ہو کر عشاء کے بعد حضرت داتا گنج بخش علی ہجویری کے مزار پر مراقب تھا کہ ایک مردانہ ہاتھ نظر آیا ۔ کافی چوڑی کلائی اور کلائی پر کافی بال، ہاتھ میں ایک فریم تھا اور اس کے اندر سرٹیفکیٹ جیسا کوئی کاغذ ۔

کراچی پہنچ کر مولوی نیاز احمد صاحب مجسٹریٹ مرحوم سے ذکر کیا (وہی نیاز احمد صاحب مرحوم جنہوں نے بچپن میں قرآن سر پر رکھوا کر مجھ سے نہ بھاگنے کی قسم لی تھی اور جس کے بعد میں پڑھنے سے کبھی نہیں بھاگا) ۔ ان کی اہلیہ مرحومہ، جنہیں ان کی اولاد اور ہم بھی بوا کہتے تھے، قریب ہی ایک چوکی پر بیٹھی قرآن شریف کی تلاوت کر رہی تھیں ۔ مجسٹریٹ صاحب نے بوا سے کہا کہ ذرا داتا صاحب سے پوچھو تو کہ کیا یہ پاس ہو جائے گا ؟ بوا نے قرآن شریف بند کیا، مراقب ہو گئیں تقریباً تین منٹ بعد آنکھیں کھولیں اور فرمایا کہ ہاں داتا صاحب کہتے ہیں کہ یہ پاس ہو جائے گا اور ایسا ہی ہوا بھی ۔

دوسرے سال بی ۔اے کے امتحان سے فارغ ہو کر حسبِ عادت عشاء کے بعد

داتا صاحب کے مزار پر جا بیٹھا۔ کسی بے پناہ مشغولیت، خصوصاً امتحان کی جان لیوا مشقت کے بعد اگر انسان دنیا سے آنکھیں بند کر کے دماغ کو اللہ کے سوا ہر خیال سے پاک کر کے اپنے اوپر مردوں جیسی کیفیت طاری کر لے اور کسی قبر کے قریب مراقب ہو جائے تو اس سے سکون ملتا ہے کیونکہ دو ہی تو قدرتی مسکن ہیں، عارضی مسکن نیند اور دائمی مسکن موت، بشرطیکہ اعمال ایسے نہ ہوں کہ "مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے" اور نیند کے بارے میں بھی یہ فرمایا گیا ہے کہ **"النوم اخوالموت"** "نیند موت کی بہن ہے" (اردو محاورے کی وجہ سے مذکر کو مؤنث بنانا پڑا)۔

مجھے بیٹھے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ کوئی صاحب میرے قریب آکر بیٹھ گئے۔ خیال ہوا کوئی نادان دانا ہو گا۔ تھوڑی دیر ہی گذری تھی کہ انھوں نے زور زور سے حق حق کے نعرے لگانا شروع کر دیئے۔ میں نے پھر بھی آنکھیں نہ کھولیں کہ مظاہر جنوں کی طرف کون ملتفت ہو۔ جوش ٹھنڈا ہوا تو میری ران تھپتپائی۔ اس دخل در مراقبات پر میں نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا واصف صاحب ہیں۔ کہنے لگے اٹھو، تمھیں چائے پلاؤں۔ ہوٹل میں چائے پیتے ہوئے فرمایا کہ قیامت میں اللہ کے اس سوال پر کہ کیا لائے ہو یہ کہنا کافی نہ ہو گا کہ بی۔اے کی ڈگری لایا ہوں، اس لئے اس طرف زیادہ توجہ کرو جو وہاں کام آئے۔ فرمایا کہ لوگ جمعہ کے لئے جاتے ہیں۔ اصل میں دینی جذبہ اور فرض کی ادائیگی کا احساس انہیں مسجد لے جاتا ہے۔ وہاں وہ خطیب کی باتیں بھی کڑوے گھونٹ کی طرح سن لیتے ہیں۔ تمھاری کلاس میں (میں اس زمانہ میں ایس۔ایم۔کالج کراچی میں لکچرر تھا) جو طبقہ آتا ہے اسے کوئی دینی جذبہ نہیں لاتا، بلکہ اس میں سے اکثر دین سے بیزار ہوتے ہیں۔ ان میں دین کا ذوق پیدا کرنا دین کی بڑی خدمت ہے اور اللہ کے یہاں کام آنے والی چیز بھی۔ لوگ تو پیٹ پر پتھر باندھ کر یہ کام کیا کرتے تھے، اور اللہ نے تمھارے لئے یہ موقع اس طرح فراہم کر دیا کہ پیٹ کی خدمت بھی ہے اور دین کی خدمت کا موقع بھی۔

لاہور سے واپس آکر واصف علی صاحب کی اس "جام و سنداں باختن" کی کیفیت جب میں نے اپنے مرشد حضرت شاہ زوّار حسین صاحب مرحوم کو لکھی تو جواب یہ آیا کہ ملامتیہ فرقے کی یہی کیفیت ہوتی ہے "ظاہر تاریک باطن روشن" لیکن:

کچھ فرق انار کی لطافت میں نہیں
ہوں اس میں اگر گلے سڑے دانے چند

مدتوں کے بعد ایک مرتبہ پھر لاہور جانا ہوا تو واصف علی صاحب کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ اس وقت دورانِ گفتگو فرمایا کہ میں امتحانات کے بعد اپنے سارے طلبہ کے نام لکھ کر پیر صاحب دیول شریف کی خدمت میں بھیج دیتا ہوں کہ جو کام میرے کرنے کا تھا میں نے کر لیا، آگے کی بات آپ جانیں اور آپ کا خدا جانے۔

قاضی ایوب صاحب

ٹونک کے قاضی ایوب صاحب جو میرے بعد عدالتِ شرعیہ کے مفتی بھی ہوئے، بڑے ظریف عالم و شاعر تھے۔ زاغ تخلص کرتے تھے۔ لیکن جس طرز کے ظریفانہ اشعار کہا کرتے تھے، چونکہ وہ ان کے علمی بھرم اور ثقاہت کے لئے زیب نہ دیتے تھے، اس لئے اپنے ایک شاگرد کو اپنا کلام عنایت فرما دیتے تھے اور وہی زاغ بن کر اصالتہً نہ کہ نیابتہً مشاعروں میں سنایا کرتا تھا۔ لیکن سب جانتے تھے کہ؛

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
انچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم
(آئینے کے پیچھے مجھے طوطی کی طرح رکھا ہوا ہے،
استادِ ازل جو کہتا ہے وہی میں بھی دہراتا جاتا ہو)

ان شاگرد کی ایک دوکان بھی تھی جس کے بورڈ پر کوے کی چونچ میں انگور کا خوشہ دکھایا گیا تھا اور اس کے نیچے قاضی صاحب ہی کا یہ شعر لکھا ہوا تھا:

پہلوئے حور میں لنگور خدا کی قدرت
زاغ کی چونچ میں انگور خدا کی قدرت

یہ تو میں جانتا ہوں کہ شاگرد کا رنگ سیاہی مائل تھا لیکن اگر یہ نقاب کشا شعر نہ ہوتا تو ان کی بیوی کے رنگ کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔

ایک مرتبہ عیش صاحب ٹونکی نے دعوت کی۔ میں بھی موجود تھا۔ گرمی کی دوپہر تھی۔ قاضی صاحب بار بار پانی پی رہے تھے۔ عیش صاحب نے کہا: قاضی صاحب کچھ کھائیں گے بھی یا پانی ہی سے پیٹ بھریں گے! فرمایا: تمہیں معلوم ہی نہیں، زیادہ کھانے کا اصول ہی یہ ہے کہ پہلے حلق تک پانی بھر لو، پھر جو لقمہ ڈالو گے غڑاپ سے

ڈوبتا چلا جائے گا۔

ایک مرتبہ چند علماء کے ساتھ بیٹھے تھے۔ سامنے سے "انتا" نام کا ایک ہندو کلال آیا، قاضی صاحب بولے: آہا! جنتی آرہا ہے۔ کسی نے کہا: قاضی صاحب، کافر اور جنتی! فرمایا: یہی نہیں اس کی بیوی بھی جنتی ہے۔ معترض بولے: غضب خدا کا قاضی صاحب، توبہ کرو، کیا کہہ رہے ہو۔ فرمایا: میں کیا کہہ رہا ہوں، قرآن یہی کہتا ہے۔ اور جب لوگ آنکھیں پھاڑے انہیں گھورنے لگے تو بڑی سادگی سے فرمایا: کیا قرآن میں یہ نہیں "**انت و زوجک الجنته**" (حضرت آدم سے فرمایا گیا تھا) تم اور تمہاری بیوی جنت میں (رہو)۔

~~ایک مرتبہ قاضی صاحب نے ایک شخص کی خیریت دریافت کی۔ اس نے جواب دیا: آنکھیں آئی ہوئی ہیں۔ قاضی صاحب نے کہا: انشاء اللہ چلی جائیں گی۔~~

ایک مرتبہ قاضی صاحب نے ایک شخص کی خیریت دریافت کی۔ اس نے جواب دیا: آنکھیں آئی ہوئی ہیں۔ قاضی صاحب نے کہا: انشاء اللہ چلی جائیں گی۔

ایک مرتبہ گرمی کی دوپہر میں ناظم شریعت قاضی صاحب کا مکان پر آرام کر رہے تھے، جو ان کے بے تکلف دوست تھے۔ ایک شخص قاضی ایوب صاحب کے گھر پہنچا اور وہاں سے یہ معلوم کرکے کہ فلاں صاحب کے گھر گئے ہیں یہاں پہنچ کر دروازہ کھٹکھٹایا۔ صاحب مکان نے پوچھا کون؟ جواب دیا: فلاں ـــ، قاضی ایوب صاحب ہیں؟

قاضی ایوب صاحب نے فوراً التجاء کی: ارے یار کہہ دے کہ نہیں ہیں، اس شخص نے پریشان کر رکھا ہے۔ قاضی صاحب کچھ ایسے غائب دماغ ہوئے کہ بڑے ثقہ لہجے میں فرما دیا: نہیں بھائی وہ یہاں نہیں ہے۔ اور جیسے ہی ان کے منہ سے یہ الفاظ نکلے، قاضی ایوب صاحب فوراً زور سے بولے: میں یہاں موجود ہوں۔ یہ ناظم شریعت ہو کر جھوٹ بولتا ہے۔ قاضی صاحب نے التجاء کی: ارے ظالم کیوں مجھے بدنام کرتا ہے!

فرمایا کہ: ہاں تو تم نے جھوٹ کیوں بولا۔ اگر میں کنویں میں گرنے کو کہتا تو کیا تم گر جاتے؟

ایک مرتبہ ٹونک میں آل انڈیا مشاعرہ ہوا۔ اسی مشاعرے میں ماہر القادری مرحوم نے اپنی مشہور غزل پڑھی تھی، جس کا ایک شعر ہے:

اے دوست چاک دامنِ یوسف کا واسطہ
آجا کبھی تو دستِ زلیخا لئے ہوئے

قاضی صاحب نے بھی اس زمین میں غزل کہی تھی۔ اس کا ایک شعر ہے:

وہ آگے آگے وصل کا اقرار ساتھ ساتھ
میں پیچھے پیچھے سر پہ ہوں کھٹیا لئے ہوئے

جگر کی ایک غزل کا مقطع ہے:

جان ہی دے دی جگر نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آہی گیا

قاضی صاحب نے اس پر تضمین کی۔ "جگر" اور "آج" کی کیسی مٹی پلید کی ہے۔

یار پرلے دن طبیعت اپنی آئی یار پر
پھیپھڑا پرسوں کیا قرباں ادائے یار پر
دل فِدا کل کر دیا تھا حسن ہائے یار پر
جان ہی دے دی جگر نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آہی گیا

یاد نہیں رہا کہ تیسرے مصرعہ میں "حسن ہائے" تھا یا کچھ اور کہتے ہیں:

کہتے ہیں:

اک بلا ہے، عذاب ہے شادی رہ گئے بن کے نقشِ فریادی
آج دے کر طلاق بیوی کو ہم منائیں گے جشنِ آزادی

مولوی عبدالکریم صاحب

سرونج میں مولوی عبدالکریم صاحب ایک بزرگ تھے۔ چونکہ چمڑے کی تجارت کرتے تھے اس لئے چمڑے والے مولوی صاحب کے نام سے مشہور تھے۔ ناشتے کے بعد ڈاک خانے جاکر اپنی ڈاک خود لانا ان کا روز کا معمول تھا، تاکہ کاروباری خطوط کسی دوسرے کے ہاتھ نہ پڑیں۔ فرماتے تھے کہ تجارت نام ہی راز داری کا ہے۔ ڈاک سے فارغ ہوتے تو صندوقچہ لے کر ڈیوڑھی میں بیٹھ جاتے، مانگنے والوں کا تانتا بندھ جاتا اور ہر ایک کو مٹھی بند کر کے ایک ایک پیسہ دیتے جاتے۔ پنج وقتہ نماز، جمعہ اور عیدین اور ڈاک کے علاوہ کسی نے انہیں کسی کام کے لئے گھر سے نکلتے نہیں دیکھا۔ البتہ نماز جنازہ اور دفن میں شرکت کا حال معلوم نہیں۔

مولوی صاحب بہت ذہین آدمی تھے۔ کسی نے پوچھ لیا کہ مولوی صاحب والدین اور اولاد کی رگوں میں حالانکہ ایک ہی خون گردش کرتا ہے لیکن والدین کے دل میں اولاد کا جو درد ہوتا ہے وہ درد اولاد کے دل میں والدین کا نہیں ہوتا۔ فرمایا: واہ اتنی سی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ چھری لے کر ران سے ایک بوٹی کاٹو اور اسے دور پھینک دو، درد کہاں ہوگا، ران میں یا بوٹی میں؟

چمڑے کے کاروبار کی وجہ سے قصائیوں سے دن رات کا سابقہ تھا، لیکن ذہانت کے باوجود فرماتے تھے کہ ساری عمر گذر گئی لیکن قصائی کی ذات کو میں اب تک ٹخنوں تک بھی نہیں سمجھ سکا۔

مولوی عبداللہ صاحب

مولوی عبداللہ چمڑے والے مولوی صاحب کے صاحبزادے تھے۔ باپ ہی کی طرح ذہین۔ دیو بند کے فارغ التحصیل تھے۔ کہنے کو عالم کہلاتے تھے لیکن اسی طرح جیسے زنگی کا نام کافور۔ حافظہ ایسا پایا تھا کہ کافیہ کی عبارتوں کی عبارتیں زبانی یاد تھیں اور مولانا ابوالکلام آزاد کی تقریروں کو فرفر دہراتے تھے۔ سرونج میں رزق سے تنگ ہوئے تو بمبئی جا کر ایک مسجد میں امام ہوگئے اور بزرگی کا ایسا ڈھونگ رچایا کہ ثریا اور نرگس تک زیر دام آگئیں۔ کہتے تھے کہ جب سرونج کے مفتی صاحب بمبئی میں میرے مہمان ہوئے تو ثریا یا نرگس (صحیح طور پر یاد نہیں رہا) نے ان کی دعوت کی اور ایک ٹائم پیس بھی بطور نذر پیش کیا۔

بمبئی سے جھولیاں بھرنے کے بعد ٹونک میں ایک حویلی خریدی اور سنا ہے وہیں اللہ اللہ کر رہے ہیں۔

ان صاحب نے ایک مرتبہ کسی صاحب کو سڑک کے کنارے ڈھیلا لیتے دیکھا اور بے خیالی میں سلام کر لیا۔ آگے بڑھے تو خیال ہوا کہ ایسی حالت میں تو سلام کرنا منع ہے، پلٹے اور کہا: ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے۔

ایک مرتبہ کہنے لگے: نواب سعادت علی خان اگر بھرے بازار سے ننگے پیر گذریں تو لوگ کہیں گے: کیا عاجزی وانکساری ہے اور اگر عبداللہ (وہ خود) اس طرح گذرے تو کہیں گے سالے کو جوتا بھی نصیب نہیں۔

تواضع ز گردن فرازاں نکوست
گدا اگر تواضع کند خوئے اوست

(تواضع متکبروں کے لیے تو خوبی ہے
لیکن فقیر اگر تواضع کرے تو یہ تو اس کی عادت ہے)

انگریزی دور میں سونے کے نوٹ پر شیر کی تصویر ہوتی تھی، کہنے لگے۔ میاں پیسے میں بڑی قوت ہوتی ہے، اگر دو وقت کا فاقہ ہو لیکن جیب میں ایک شیر چھاپ پڑا ہو تو جب ڈکار آتی ہے شیر جیسی آتی ہے "غاؤں" اور جب جیب میں ایک پائی بھی نہ ہو تو چاہے ابھی کھا کر نکلے ہوں ڈکار مسکین بلی کی طرح آتی ہے "میاؤں"۔

اگر زندہ ہیں تو اللہ بعافیت رکھے اور انجام بخیر فرمائے۔

ماسٹر سعید الحسن خان صاحب

ماسٹر سعید الحسن خان صاحب جے پوری سے میری ملاقات اس وقت ہوئی جب میرا تقرر دوجانہ کے اورینٹل کالج میں پرنسپل کی حیثیت سے ہوا۔ ماسٹر صاحب دوجانہ کے ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔

ایک سال سے کچھ زیادہ عرصہ دوجانہ میں ملازمت کے بعد انہوں نے جے پور واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔

اس عرصے میں چونکہ ان سے میری ملاقات کی نوعیت بالکل گھریلو قسم کی ہو چکی تھی اس لئے وہ مجھے بھی اپنے ساتھ جے پور لے گئے۔ پہلے وہ جے پور کے مسلم ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ جب وہ دوبارہ واپس آئے تو سیکنڈ ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے اسکول جوائن کر لیا اور عربی اور اردو پڑھانے کے لئے مجھے بھی اسی اسکول میں ملازم رکھوا دیا۔ اور مجھے اپنے ساتھ اپنے ہی مکان میں رکھا۔

ماسٹر صاحب کو انگریزی اور حساب پڑھانے میں مہارت تھی اور ظاہر ہے کہ ان دو مضمونوں کی ہمیشہ قدر رہی ہے۔

اسکول کی ملازمت کے ساتھ ساتھ ماسٹر صاحب نے بازار میں چٹنی، اچار، بسکٹ وغیرہ کی ایک دوکان بھی کھولی ہوئی تھی۔

ماسٹر صاحب نے جے پور آنے کے چند ماہ بعد ایک بڑی بلڈنگ کی ایک پوری منزل کرایہ پر لی، ایک حصہ میں رہائش اختیار کی اور دوسرے حصہ کو میٹرک کے طلبہ کے لئے ہوسٹل بنایا اور اس پوری منزل کا کرایہ وہ ہوسٹل کے طلبہ سے لیتے تھے۔

ان کا روزمرہ کا معمول یہ تھا:

فجر کی نماز پڑھ کر دوکان پر جانا، نو بجے تک دوکانداری کرنا اور ساتھ ہی ان

لڑکوں کو پڑھاتے بھی جانا جو ٹیوشن کے لئے ان کی دوکان پر آجایا کرتے تھے ۔ نو بجے تک اگر گھر سے کھانا نہیں آیا تو تنور سے روٹی منگوائی اور اچار، چٹنی نکال کر کھالی، پھر اسکول چلے گئے ۔ اسکول سے شام کو سیدھے دوکان پر آئے اور مغرب تک کے لئے پھر دوکانداری اور ٹیوشن میں مشغول ہو گئے ۔ مغرب کی نماز گھر جاکر پڑھی اور کھانا کھایا، پھر عشاء کی نماز پڑھ کر ہوسٹل کے لڑکوں کو دو گھنٹہ پڑھایا اور پھر سو گئے ۔ تہجد کے وقت لڑکوں کو اٹھاکر پھر انہیں ایک گھنٹہ پڑھایا، پھر فجر کی نماز پڑھ کر دوکان پر چلے گئے ۔

یہ ان کا روزمرہ کا معمول تھا ۔ اس طرح ظاہر ہے کہ ان کی آمدنی وافر تھی، لیکن ساری آمدنی وہ اپنی بیوی کو دے دیا کرتے تھے ۔ خود ان کی زندگی بے انتہا سادہ تھی، جو مل گیا کھالیا، جو بیوی نے بنادیا پہن لیا ۔ ان کی ذات کے برعکس ان کے گھر میں عیش و عشرت کے تمام سامان تھے، کھانا تقریباً روزانہ ایسا پکتا تھا جیسا دعوتوں میں پکایا جاتا ہے ۔ آئے دن طرح طرح کی مٹھائیاں بنتیں اور پکوان پکتے ۔ لیکن ماسٹر صاحب کو ان چیزوں کی طرف کوئی رغبت نہ تھی، سامنے آگیا تو کھالیا، ورنہ چٹنی روٹی پر گذر کر لیا ۔ میں چونکہ انہی کے ساتھ رہتا تھا اس لئے ان کی ذات اور ان کے گھر والوں کا یہ فرق میری آنکھوں کے سامنے تھا ۔ اپنی رہائش اور کھانے کا میں انہیں کوئی معاوضہ نہ دیتا تھا، وہ مجھ سے گھر کے ایک فرد کا سا سلوک کرتے تھے، البتہ میں ان کی ایک بچی کو پڑھا دیا کرتا تھا جو ادیب کی تیاری کر رہی تھی ۔

میں نے ان کے ساتھ رہتے اور جے پور مسلم ہائی اسکول میں ملازمت کرتے ایک سال گذارا ۔ بیوی اور بچی کی جدائی بھی شاق گذرنے لگی اور والد صاحب مرحوم نے بھی لکھا کہ تم سرونج آجاؤ ۔ چنانچہ میں سرونج آکر پھر سعادت ہائی اسکول میں ملازم ہو گیا ۔

جے پور سے روانگی سے قبل ماسٹر صاحب نے ایک روز تنہائی میں مجھے بٹھایا اور

کہا کہ میں تمہیں اپنے چھوٹے بھائی کی طرح سمجھتا ہوں اس لئے ایک نصیحت کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ دوستوں کے بجائے اپنا زیادہ سے زیادہ وقت پیسہ کمانے میں صرف کرو اور جو کچھ کماؤ اس سے خود کوئی سروکار نہ رکھو، سب بیوی کو دیتے جاؤ، کیونکہ پیسے کے بغیر دوست احباب تو کیا بیوی بھی بیوی نہیں رہتی۔ تم دیکھ رہے ہو کہ میری زندگی کا بھی یہی رنگ ہے اور یہ میری اصل طبیعت کا رنگ نہیں، مصنوعی ہے جسے میں نے ایک واقعے کے بعد دانستہ اختیار کیا ہے۔ ہوا یہ کہ جب میں یہیں جے پور میں مسلم ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھا تو ایک مرتبہ بیمار پڑا، بیماری طویل ہوئی۔ پہلے پوری پھر نصف تنخواہ پر اور اس کے بعد بلا تنخواہ رخصت لینی پڑی۔ گھر میں بے انتہا تنگی ہو گئی۔ میری یہ حالت کہ میں رات بھر جاگتا اور کھانستا رہتا تھا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ خون بننا بند ہو گیا اور ڈاکٹروں نے کہہ دیا کہ نہیں کہہ سکتے کہ کب زندگی آپ کا ساتھ چھوڑ دے۔

ایک رات میں جاگ رہا تھا اور کھانستا جارہا تھا تو میں نے کانوں سے بیوی کو یہ کہتے سنا کہ اللہ انہیں اٹھا بھی تو نہیں لیتا! اپنے ساتھ ہماری زندگی بھی حرام کر رکھی ہے۔ کیا کر سکتا تھا، سن کر پی گیا۔

ایک رات میں نے ایک بزرگ کو خواب میں ایک بلیک بورڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دیکھا۔ اس پر STOP THINKING لکھا ہوا تھا۔ اس خواب سے میں نے یہ سمجھا کہ میرا موجودہ مرض محض وہم کا نتیجہ ہے چنانچہ میں نے وہم ترک کر دیا۔ باغوں میں جاتا، تالاب کے کنارے وقت گذارتا، قوالی سنتا، رنڈیوں کے کوٹھوں پر جا کر گانے سنتا، اس طرح زندگی گذارتے ایک ہفتہ ہی گذرا تھا کہ ڈاکٹروں کو دکھایا تو انہوں نے کہا کہ آپ کا تو خون بننا شروع ہو گیا۔ رفتہ رفتہ میں بالکل تندرست ہو گیا۔ اس کے بعد سے میں نے یہ وتیرہ بنالیا کہ زیادہ سے زیادہ کماؤ اور بیوی کو بھرتے جاؤ تاکہ اسے کسی وقت تنگی کی شکایت نہ رہے۔

اس کے بعد ان سے کراچی میں سڑک پر ملاقات ہوئی، اس طرح کہ گدھا گاڑی ہانک رہے تھے اور گاڑی میں لفافے لدے ہوئے تھے جن میں دوکاندار چیزیں رکھ کر دیا کرتے ہیں۔ مجھ سے پوچھا کب آئے؟ میں نے کہا تین روز ہوئے ہیں۔ کہنے لگے بھیا کوئی فکر مت کرنا، گھر موجود ہے، اسی طرح لفافے بنائیں گے اور بیچیں گے اور گھر کا پتہ سمجھا دیا۔ میں گھر پہنچا جو عیدگاہ میدان کے پچھلی سمت میں تھا۔ دیکھا کہ ایک کمرے میں محلہ کے بچے جمع ہو کر لفافے بنا رہے ہیں اور ایک حصے میں پرائمری اسکول چل رہا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ مجھے چونکہ چھٹے روز ہی ملازمت مل گئی اس لئے میں ان کے ساتھ ان کے کاروبار میں شریک نہ ہو سکا۔

امیرالدین صاحب

میں جس زمانے میں اورینٹل کالج دوجانہ میں پرنسپل تھا امیر الدین صاحب مجسٹریٹ تھے، جو جے پور کے ریٹائرڈ سیشن جج اور وہیں کے باشندے تھے۔

امیر الدین صاحب نے بیان کیا کہ ان کے دادا گھوڑوں کے تاجر تھے۔ ایک مرتبہ استنبول سے کچھ گھوڑے خرید کر لائے۔ جے پور پہنچے ہوئے کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ دو تُرک آئے اور منہ مانگے داموں پر ایک گھوڑے کا سودا کر لیا۔ سودا ہو چکنے کے بعد انہوں نے بتایا کہ ہمیں حکومت کی جانب سے یہ گھوڑا ہر قیمت پر واپس لانے کے لئے مامور کیا گیا ہے۔ یہ خالص عربی نسل کا گھوڑا ہے اور حدودِ مملکت سے اس کا باہر نکالنا ممنوع ہے۔ ان کے دادا کو تعجب ہوا کہ ایسے بدصورت گھوڑے میں جس کی پیٹھ اور کنوتیاں خچر کی طرح جھکی ہوئی ہوں ایسی کیا خصوصیت ہے کہ اس کے باہر نکلنے پر حکومت نے قدغن لگا رکھی ہے۔ پوچھا تو ایک ترک نے جواب دیا کہ میں اس پر سوار ہوتا ہوں اور چند لوگ ایک دائرے کی شکل میں لاٹھیاں لے کر کھڑے ہو جائیں۔ جب میں گر جاؤں تو لوگ مجھ پر حملہ کر دیں۔ چنانچہ پہلی بات تو یہ دیکھی گئی کہ جونہی ترک اس پر سوار ہوا اس کی پیٹھ کا خم دور ہو گیا دونوں کنوتیاں تن گئیں اور پہلے وہ جتنا بدصورت نظر آتا تھا اتنا ہی خوبصورت نظر آنے لگا۔ پھر جب سوار کے گرنے پر لوگوں نے لاٹھیوں سے حملہ کیا تو دیکھا کہ گھوڑا سوار کے چاروں طرف چکر کاٹ رہا ہے اور اپنی دولتیوں سے کسی کو سوار کے پاس بھی نہیں پھٹکنے دیتا۔

باقی ماندہ گھوڑے بیچنے کے لئے ان کے دادا گنگا اور جمنا کے سنگم پر کمبھ کے میلے میں الہ آباد گئے۔ وہاں دیکھا کہ دو سپیروں میں ٹھن گئی اور بات یہاں تک بڑھی کہ تو اپنے سانپ سے مجھے ڈسا اور میں تجھے۔ پھر دیکھیں کہ ماہر فن کون ہے۔ چنانچہ ایک

سپیرے نے سانپ نکالا۔ دوسرے نے اسے دیکھ کر اپنے چیلے کو چار پڑیاں دیں اور کہا کہ اس کے کاٹنے پر میں بے ہوش ہو کر گر پڑوں گا۔ پہلے مجھے یہ پڑیا دینا، جب منہ سے جھاگ آنے لگیں تو دوسری پڑیا دینا، جب رنگ زرد پڑ جائے تو تیسری دینا اور زردی دور ہو جائے تو چوتھی۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور چوتھی پڑیا پر اسے ہوش آگیا۔ اب اس کی باری تھی۔ اس نے کہا کہ اس وقت تو میرے پاس وہ سانپ نہیں ہے جس سے ڈسانا چاہتا ہوں۔ اگر مرد ہے تو اگلے سال اسی جگہ آجانا۔ یہ بات مشہور ہو گئی اور دوسرے سال لوگ بکثرت یہ تماشا دیکھنے پہنچے، جن میں امیر الدین صاحب کے دادا بھی تھے۔ جب سپیرے نے نلکی سے ایک بالشت کا سفید سانپ نکال کر بتایا تو دوسرا سپیرا ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا کہ میں ہارا تو جیتا۔

جس کو اپنے فن پر اتنا اعتماد ہو کہ وعدہ کے مطابق دوسرے سال پہنچ گیا، اس کی یہ عاجزی دیکھ کر لوگ متعجب ہوئے تو سانپ والے نے اس کی جو خصوصیت بتائی وہ ناقابل یقین ہے۔ اس نے کہا کہ یہ سانپ اگر کاٹ لے تو نہ صرف وہ جسے کاٹا ہے بلکہ اس کے خون سے تعلق رکھنے والے تمام افراد مر جاتے ہیں۔ اس کا تجربہ کرانے کے لئے وہ لوگوں کو دریا کے کنارے اُگے ہوئے نرسلوں کے پاس لے گیا اور سانپ کو اس نرسل کی ایک شاخ پر چھوڑا جس کی جڑ سے متعدد شاخیں نکلی ہوئی تھیں۔ سانپ کے منہ سے ایک شعلہ لپکا اور اس جڑ سے متعلق تمام شاخیں بھک سے اڑ گئیں۔ واللہ اعلم۔

اچھن میاں

اچھن میاں عمر میں مجھ سے بڑے ہونے کے باوجود میرے دوستوں کی فہرست میں تھے۔ شعری ذوق نہایت لطیف تھا، بہترین اشعار بکثرت یاد تھے۔ پان بہت کھاتے اور چائے بہت پیتے اور پلاتے تھے۔ شطرنج کا شوق تھا اور یہی شوق چند دوستوں کو فرصت کے اوقات میں ان کے بالاخانے میں جمع کر دیا کرتا تھا۔ کبھی کبھی شعر و سخن کی باتیں ہوتی تھیں۔ اچھن میاں خود بھی شاعر تھے۔ زار تخلص تھا۔ سنا ہے ان کا دیوان شائع ہو چکا ہے۔ ان کا ایک شعر ہے:

دلِ بیتاب کی حالت ہے کتنی رحم کے قابل
نہ وہ اپنا سمجھتے ہیں، نہ ہم اپنا سمجھتے ہیں

اچھن میاں ایک ٹیپکل (Typical) آدمی تھے۔ کہتے تھے کہ میں نے آج تک (جبکہ اس وقت ان کی عمر چالیس سے متجاوز ہو گی) کوئی پھل نہیں کھایا اور کھانے میں میری عادت یہ ہے کہ صرف صبح و شام کھانا کھاتا ہوں (اور ہمارے بچپن میں صرف دو وقت ہی کھانے کا رواج تھا، ناشتے کا رواج نہ تھا)۔ باورچی خانے میں بیٹھ جاتا ہوں، روٹی اترتی جاتی ہے، اس میں گھی لگایا جاتا ہے اور گائے کے کوفتوں کے ساتھ وہ روٹی کھاتا ہوں۔ اگر کسی وقت کوفتے نہ ہوں، اور ایسا شاذونادر ہی ہوتا ہے، تو گڑ سے۔ کہتے تھے کہ میں نے کوفتوں کے سوا کوئی سالن نہیں کھایا اور چائے کو چھوڑ کر گڑ کے سوا کوئی مٹھاس نہیں چکھی۔ کہتے تھے کہ میری اس عادت کی وجہ سے میری بیوی ایک روز کے لئے بھی کہیں نہیں جا سکتیں اور گوشت پیستے پیستے سل میں کافی گڑھا پڑ گیا ہے۔

ہم نے اچھن میاں کو کبھی کسی تقریب یا دعوت میں کھاتے نہیں دیکھا۔

[illegible]

کراچی آکر میں نے حکیم عبدالکریم صاحب جیلانی (جن سے میرے قریبی تعلقات تھے) دریافت کیا کہ کیا آپ کے پاس سنکھیا ہے؟ فرمایا تقریباً تیس سال پہلے دلی سے خریدا ہوا بہترین قسم کا اصلی سپید سنکھیا رکھا ہوا ہے۔ اس میں سے انہوں نے تقریباً آدھ پاؤ کی ڈلی مجھے دے دی اور میں نے مذکورہ ترکیب کے مطابق اس کا استعمال شروع کر دیا۔

استعمال سے قبل اپنے بہت ہی قریبی دوست حکیم محمود احمد صاحب برکاتی سے بھی اس کا ذکر آیا تھا۔ برکاتی صاحب سمیات کے استعمال کے سخت مخالف ہیں۔ انہوں نے مجھے اس کے استعمال سے سختی سے منع کیا۔ میں نے کہا کہ اتنی سی مقدار سے کیا

نقصان ہوگا۔ کہنے لگے اگر اتنی سی مقدار سے نقصان نہیں ہوتا تو نفع کیوں ہوتا ہے۔ میں خاموش ہو گیا۔ لیکن از سرِ نو جوان بننے کے شوق کی وجہ سے استعمال سے باز نہیں رہا۔

استعمال کئے ہوئے پندرہ روز ہی گذرے تھے کہ دونوں مونڈھوں کے درمیان گردن کی جڑ میں ایک پھوڑا ابھرا، جس کی شدید تکلیف سے میں بے حال ہو گیا سوچا کہیں یہ سنکھیا کا اثر تو نہیں! برکاتی صاحب سے ذکر کیا تو انہوں نے یہ سوچ کر کہ لوہا گرم ہے، چوٹ کاری لگے گی، کہہ دیا کہ: میں تو پہلے ہی منع کرتا تھا۔ حالانکہ میں اور مجھ سے زیادہ برکاتی صاحب اس سے واقف ہیں کہ پھوڑے کی متعدد وجوہ ہو سکتی ہیں، ضروری نہیں کہ سنکھیا ہی کا اثر ہو۔ بہرحال وجہ کچھ بھی ہو، میں نے سنکھیا ترک کر دیا۔

میرے ایک قریبی عزیز تھے، ان کے بٹوے میں سنکھیا چھالیہ کے ساتھ کترا ہوا پڑا رہتا تھا۔ بہت عیاش تھے اور سنکھیا کی بدولت اپنی غیر ازدواجی زندگی میں پرستش کی حد تک مقبول تھے۔ ان کی آخری عمر ایک دھوبن کے گھر گذری جو اس حالت میں ان کی کفالت و خدمت کیا کرتی تھی جب سنکھیا ان کے پیروں سے خون اور پیپ کی شکل میں پھوٹ پڑا تھا۔ ہر وقت پیروں پر کپڑے لپٹے رہتے تھے اور لکڑی کے سہارے کے بغیر قدم اٹھانا بھی دشوار تھا۔

سنکھیا خواہ کچا ہو یا کشتہ، اگر اس کے ساتھ مرغن غذا نہ ملے تو جیسا کہ سنا ہے، آخر عمر میں یہی رنگ لاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ سنکھیا جسم سے خارج نہیں ہوتا، مرغن غذاؤں سے دبا رہتا ہے اور توانائی بخشتا ہے۔ جب نہ ملیں تو جسم کے کسی حصے، خصوصاً پیروں سے پھوٹ کر نکلتا ہے۔

سنکھیئے کو عربی میں "سم الفار" کہتے ہیں یعنی چوہوں کا زہر۔ اگر سنکھیئے کا سفوف آٹے میں ملا کر چھوٹی چھوٹی گولیاں بنا کر گھر میں ڈال دی جائیں، اس احتیاط کے ساتھ کے گولی کسی بچے کے ہاتھ نہ لگے، تو ایک دو چوہے تو مرتے ہیں باقی سب گھر چھوڑ کر

بھاگ جاتے ہیں ۔ اس کا میں نے تجربہ کیا ہے ۔

ایک بزرگ نے سنکھیئے کے استعمال کا یہ طریقہ بتایا کہ ایک تولہ سنکھیئے کا سفوف لے کر اس میں ایک تولہ چینی کا سفوف ملایا جائے ۔ پھر اسے نصف کر کے اس میں ایک تولہ چینی ملا لی جائے ۔ اسی طرح ہر مرتبہ نصف کر کے ہر بار ایک تولہ چینی ملاتے جائیں اور سوویں بار جو بچے وہ استعمال کیا جائے اور اس طرح ایک تولہ سنکھیا ختم کر لیا جائے ۔

حاجی محمد اعلیٰ صاحب نے بتایا کہ سنکھیئے کے آدھ پاؤ محلول میں ایک سیر پانی ملایا جائے اور اس میں ایک درجن انڈے ابال لیے جائیں ۔ انڈوں کو اچھی طرح دیکھ لیا جائے، کوئی ٹوٹا ہوا نہ ہو اور ابالنے کے بعد پھر دیکھا جائے ۔ اگر کسی میں دراڑ پڑ گئی ہو تو اسے پھینک دیا جائے اور سالم انڈوں کی زردی نکال کر اس کا حلوہ بنا لیا جائے اور روزانہ ایک تولہ استعمال کیا جائے ۔

سنکھیئے کے ہر استعمال پر دودھ اور گھی کا استعمال ضروری ہے ۔

بیچو خان صاحب

بیچو خان صاحب اچھن میاں کے والد تھے۔ سرونج کے معززین میں سے شمار ہوتے تھے اور تجارت پیشہ تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے ساہوان رتلام کی کوٹھی سے پندرہ اشرفیاں قرض لیں اور گھی کے چند کنستر رہن رکھے۔ کنستروں میں نیچے پانی بھرا اور اوپر گھی، سردیوں کا زمانہ تھا اوپر گھی جم گیا۔ وعدہ کے مطابق انہوں نے اشرفیاں ادا کیں اور کنستر چھڑالئے اور اس وقت منیب جی کو بتایا کہ نہ میرے پاس پیسے تھے اور نہ پندرہ اشرفیوں کی قیمت کا گھی اور پیسوں کی مجھے ضرورت تھی اس لئے میں نے یہ حرکت کی تھی، آپ معاف فرمائیں۔

لیکن اشرفیاں واپس کرتے وقت یہ صورت پیش آئی کہ منیب جی کچھ لکھنے میں مصروف تھے خان صاحب نے جب کہا کہ پندرہ اشرفیاں جمع کر لیجئے تو انہوں نے کہا کہ رکھ دیجئے، ابھی لیتا ہوں۔ لکھنے سے فارغ ہو کر انہوں نے اشرفیاں اٹھائیں تو نہ جانے کیسے ایک اشرفی دوات میں گر گئی اور پتہ بھی نہ چلا۔ منیب جی نے گن کر کہا کہ خان صاحب چودہ ہیں۔ خان صاحب نے جواب دیا: چودہ ہوں گی۔ منیب جی نے کھاتے میں ٹانک لیں۔

بڑے بڑے مہاجنوں کے یہاں سیاہ روشنائی کی بڑی بڑی پیتل کی دواتیں ہوتی تھیں جو ہر سال دیوالی کے موقع پر، جو ایک بڑا تہوار ہے، دھلا کرتی تھیں۔ دیوالی آئی اور دواتیں حسبِ معمول دھلیں تو ایک اشرفی ٹپکی۔ منیب جی کو معلوم ہوا تو کھلبلی مچ گئی، بہی کھاتوں کی پڑتال ہونے لگی۔ دفعتہً منیب جی کو یاد آیا کہ ایک مرتبہ بیچو خان صاحب نے اشرفیاں جمع کرائی تھیں، یہ کہہ کر کہ پندرہ اشرفیاں جمع کر لیجئے۔ اور گن کر جب میں نے کہا تھا کہ خان صاحب چودہ ہیں تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ چودہ ہوں

گی۔

خان صاحب کو بلوایا گیا اور اشرفیوں کا قصہ دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ منیب جی لایا تو میں پندرہ اشرفیاں ہی تھا، لیکن جب آپ نے کہا کہ چودہ ہیں تو ایک اشرفی کی خاطر آپ کی بات کیا جھٹلاتا!

اتفاق سے منیب جی اور خان صاحب میں کسی بنا پر نااتفاقی ہو گئی۔ خان صاحب نے منیب جی کے خلاف دعویٰ دائر کر دیا۔ دونوں چونکہ شہر کے معزز لوگوں میں شمار ہوتے تھے اس لئے سرونج کے ناظم (کلکٹر) کے نام نواب سعادت علی خان صاحب کا حکم آیا کہ ان کا مقدمہ ہمارے پاس منتقل کر دیا جائے اور دونوں کو ٹونک بھیج دیا جائے۔

مقدموں کے فیصلے چٹکی بجاتے تو ہوتے نہیں، وہ بھی ایسے مقدمے جن کے فیصلے نوابوں کو کرنے ہوں۔ نوابوں کو ریاست کے اہم ترین امور اور دوسرے غیر شرعی مشاغل سے جب فرصت ملتی تھی تب وہ اس قسم کے مقدمات لے کر بیٹھتے تھے۔ دونوں کے قیام کا زمانہ طویل ہوا اور خان صاحب کا سفر خرچ جواب دینے لگا۔ ساہوان رنگلام کی کوٹھی چونکہ ٹونک میں بھی تھی اس لئے منیب جی کے لئے تنگی کا کوئی مسئلہ ہی نہ تھا۔ منیب جی کو خان صاحب کی تنگدستی کا حال معلوم ہوا تو ایک رات، رات گئے تانگہ پر پرانے ٹونک پہنچ کر خان صاحب کی قیام گاہ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ نکلے تو کہا! خان صاحب مقدمہ اپنی جگہ ہے لیکن میں نے سنا ہے کہ آپ کا ہاتھ تنگ ہو گیا ہے، دو توڑے روپیوں کے لایا ہوں، یہ رکھ لیجئے۔ خان صاحب نے یہ کہہ کر کہ آپ نے جو کچھ سنا ہے صحیح ہے، روپئے رکھ لئے اور صبح نواب صاحب کے سرکار میں درخواست گذار دی کہ مجھے منیب جی سے کوئی شکایت نہیں، مقدمہ خارج کر دیا جائے۔

کیسے وضع دار لوگ تھے!

محبوب عالم صاحب

محبوب عالم صاحب (تھانیدار) میرے بزرگوں میں سے تھے۔ داڑھی والے نہ تھے مگر متقی و پرہیزگار۔ پولیس والوں میں ایسے لوگ خال خال ہوتے ہیں۔ ورنہ کہاں پولیس کی ملازمت اور کہاں تقویٰ و طہارت۔

یہ بات میں نے ریاست ٹونک کے بعض پولیس افسروں میں دیکھی کہ ہم سے بڑھ کے ڈاڑھی اور ٹخنے تک اونچا پائجامہ ہے۔ پیشانی پر گٹا پڑا ہوا ہے، ہاتھ میں تسبیح ہے اور مجال ہے کہ تہجد کی نماز بھی فوت ہو جائے۔ صدین کا یہ اجتماع ان لوگوں میں پایا جاتا تھا جو رشوت کو "فضل ربی" کہتے کے بجائے کے دل سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد پر ایمان رکھتے تھے کہ "**الراشی والمرتشی کلا ھما فی النار**" (رشوت دینے اور لینے والا دونوں جہنم میں ہوں گے)۔

محبوب عالم صاحب کا شمار انہی پولیس افسروں میں تھا۔ انہوں نے مجھ سے بیان فرمایا کہ ایک مرتبہ میری چھوٹی جوان بہن بیمار ہوئی، حتیٰ کہ ہم اس کی زندگی سے مایوس ہو گئے۔ ایک صبح، رات بھر باری باری جاگنے کے بعد، سب لوگ بہن کو غافل چھوڑ کر کوٹھے سے نیچے اترے تاکہ ضروری حوائج سے فارغ ہو سکیں۔ سب سے پہلے میں فارغ ہوا اور کوٹھے پر چڑھا تو اندر قدم رکھتے ہی عجیب قسم کی خوشبو محسوس کی، ایسی کہ ناک پہلے کبھی اس طرح کی خوشبو سے مانوس نہ تھی۔ میں وہیں ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا، والدہ کو اشارہ سے بلایا۔ اوپر پہنچتے ہی انہوں نے پوچھا یہ خوشبو کیسی ہے؟ پھر بیوی کو بلایا۔ انہوں نے بھی وہاں قدم رکھتے ہی وہی سوال کیا۔ جو خود مبہوت ہو وہ دوسروں کو کیا جواب دیتا۔

میں آہستہ آہستہ بہن کے پاس پہنچا اور اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ ہاتھ رکھتے

ہی اس نے آنکھیں کھول دیں، انتہائی غصے سے مجھے گھورتے ہوئے چلائی: تم کیوں آئے، نکل جاؤ یہاں سے اور رونے لگی۔ غصہ فرو ہونے پر میں نے پوچھا۔ رو رو کر کہنے لگی کہ میرے سرہانے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے اور میرے سر پر ہاتھ پھیر کر فرما رہے تھے کہ بیٹی گھبراؤ نہیں، تم اچھی ہو جاؤ گی۔ آپ نے پیشانی پر ہاتھ رکھ کر مجھے جگا دیا اور میں حضورؐ کی رویت سے محروم ہو گئی۔

اس کے تھوڑی دیر بعد بہن نے کہا کہ مجھے بھوک لگی ہے، بیوی نے مجھ سے کہا کہ ابھی تو اس کی پرہیزی غذا تیار نہیں۔ میں نے کہا کہ اب کیا پرہیز، جو کچھ موجود ہے وہی لاؤ۔ چنانچہ صحت مند آدمیوں کے لئے رات کے پکائے ہوئے کھانے کا پسماندہ اسے کھلایا گیا اور رفتہ رفتہ وہ ایسی صحت مند ہوئی جیسے کبھی بیمار ہی نہ پڑی تھی۔

عبدالوحید خان صاحب

عبدالوحید خان صاحب جاگیردار مرحوم سرونج کے معززین میں شمار ہوتے تھے انہوں نے ایک کنواری لڑکی سے شادی کی جبکہ وہ خود ۶۵ کے پیٹے میں تھے اور ان کی بیٹیاں بھی عمر میں اپنی سوتیلی ماں سے بڑی تھیں۔ سرونج میں یہ انوکھا واقعہ تھا، بڑی چہ میگوئیاں ہوئیں۔

عبدالوحید خان صاحب کا برسوں سے معمول تھا کہ وہ سردیاں آنے سے پہلے ایک جوان اصیل مرغ لے کر پنجرے میں بند کر دیا کرتے تھے اور آٹے میں ملا کر اسے شنگرف کھلاتے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ تمام پر جھڑ کر وہ صرف گوشت کا لوتھڑا رہ جاتا تھا پھر اسے ذبح کر کے ایک سیر خالص گھی میں تلواتے تھے اور وہ گھی اتار کر رکھ لیا کرتے تھے۔ پوری سردیوں میں اسی گھی کو ناشتہ میں استعمال کرنا ان کا معمول تھا۔

صاحبزادہ محمد علی خان صاحب

صاحبزادہ محمد علی خان صاحب میرے بزرگ ہیں۔ بعد میں موصوف نے مجھے دوست کا درجہ عطا فرمادیا۔ انتہائی ظریف، شیرینی کے رسیا، اتنے کہ قورمہ میں بھی شکر ڈال کر کھاتے تھے۔ ایک جگہ چائے سے تواضع ہو رہی تھی۔ میزبان نے ان سے دریافت کیا، شکر کتنی ڈالوں؟ فرمایا تین چمچوں سے شروع کرو، جب کو ٹاپورا ہو جائے گا میں بس کہہ دوں گا۔ چنانچہ کوٹا آٹھ پر پورا ہوا، یہ کہتے ہوئے کہ اب آگے بڑھاتے شرم آتی ہے۔

ٹونک میں قافلہ کی مسجد میں نماز کے لئے لوگوں نے بہت انکار کے باوجود امام بنا دیا۔ انہوں نے مقتدیوں سے اس طرح انتقام لیا کہ بڑا لمبا قیام کیا، اسی مناسبت سے رکوع اور اسی مناسبت سے لمبا سجدہ۔ جب دوسرے سجدے میں گئے تو خاموشی سے اٹھے اور سب کے جوتے چادر میں باندھ کر بھاگ لئے۔ جب معمول سے زیادہ دیر ہوئی تو کسی نے کنکھیوں سے دیکھا، امام کا مصلا خالی تھا۔

سرونج میں ایک بزرگ تشریف لاتے تھے، پیر عبدالسمیع صاحب مرحوم۔ صاحبزادہ صاحب بھی ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے تھے۔

ایک مرتبہ صاحبزادہ صاحب نے فضل الرحمٰن صاحب منیجر فارم سے گلتھی کی دعوت طلب کی۔ ان کے انکار پر کہا کہ میں تم سے دعوت کھا کر رہوں گا۔ یہ کہہ کر ان کے خلاف عدالت میں اپنی مرغی کی چوری کا مقدمہ دائر کر دیا اور جھوٹے گواہ بھی تیار کر لئے۔ مجسٹریٹ صاحبزادہ صاحب کی ظریفانہ عادت کو بھی جانتا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ یہ سب جھوٹ ہے، لیکن قاضی چونکہ اپنے علم کے بجائے شہادت کے مطابق فیصلہ کرنے پر مجبور ہے، اس لئے مقدمے نے ایسی نوعیت اختیار کر لی کہ فضل الرحمٰن

صاحب سزا یا جرمانے سے نہ بچ سکتے تھے۔ بالآخر فضل الرحمٰن صاحب کو دعوت کے وعدے پر راضی نامہ کرنا پڑا۔ اور طے یہ ہوا کہ صاحبزادہ صاحب کے لئے بطور خاص گلتھی پکوائی جائے گی۔

دعوت کے لئے جمعرات کا دن طے ہوا، بعد مغرب۔ وہ وقت پیر عبدالسمیع صاحب کے حلقے کا وقت ہوتا تھا۔ مغرب کے بعد صاحبزادہ صاحب نے اجازت چاہی تو پیر صاحب نے ڈانٹ کر کہا کہ حلقے میں بیٹھو۔ قہر درویش برجان درویش بیٹھ گئے اور مراقبہ عشاء کے قریب ختم ہوا۔

پیر صاحب کی عادت تھی کہ مراقبے کے بعد مریدوں سے فرداً فرداً دریافت فرمایا کرتے تھے کہ تمہیں کیا نظر آیا۔ ایک صاحب نے کہا: مجھے تجلیاتِ باری تعالیٰ نظر آتی رہیں۔ پیر صاحب نے فرمایا: چلو بھکوے، تجلیاتِ باری تعالیٰ آج تک تیرے پیر کو نظر نہیں آئیں تجھے کہاں سے نظر آگئیں۔ صاحبزادہ صاحب کی باری آئی تو جواب دیا: حضور مجھے تو پورے مراقبے میں گلتھی نظر آتی رہی۔ مزاج جانتے تھے، سب ہنس دیئے۔

صاحبزادہ محمد صدیق خان صاحب

محمد علی خان صاحب کے والد صاحبزادہ محمد صدیق خان صاحب بڑے جاگیردار تھے۔ نوابی ٹھاٹھ کے ساتھ ساتھ تجارتی کاروبار بھی تھا۔ ایک مرتبہ رمضان کے مہینہ میں پیرو بیچارے نے تین روپے قرض لئے کہ فلاں تاریخ کو واپس کر دوں گا۔ حساب روزانہ چیک کرتے تھے۔ وعدے کے مطابق پیرو روپئے نہ لایا۔ ملازم کو بھیجا کہ اسے پکڑ لائے۔ آیا تو پوچھا: تم نے وعدے کے مطابق قرض کیوں نہ ادا کیا؟ میاں انتظام نہ ہو سکا، اس نے جواب دیا۔ فرمایا: اللہ کی نیاز سے (یہ ان کا تکیہ۔ کلام تھا) شریعت میں وعدہ خلافی حرام ہے۔ پھر سپاہی کو حکم دیا کہ اسے بند کر دو۔ ان کا ذاتی جیل خانہ بھی تھا پیرو کو بند کر دینے کے بعد باورچی خانے کے مہتمم الیاس سے کہا کہ معلوم کرو کہ اس کے گھر میں کتنے افراد ہیں۔ ماں، بیوی اور دو بچے، کل چار افراد تھے۔ الیاس سے فرمایا کہ ہم تو صرف ایک وقت کھاتے ہیں لیکن غریب محنت کش تین وقت کھاتے ہیں: ناشتہ، دوپہر کا کھانا پھر رات کا کھانا اور کوئی ضروری نہیں کہ گھر والوں پر روزے بھی فرض ہوں، لہذا ہر رات کو ہمارے خاصے کے کھانے میں سے اتنا کھانا اس کے گھر پہنچایا کرو کہ چاروں کے لئے تینوں وقت کو کافی ہو۔ حکم کی تعمیل ہونے لگی۔

عید قریب آئی تو فرمایا کہ غریب آدمی بھی اپنے بچوں کے لئے عید پر کپڑوں کا اہتمام کرتا ہے۔ اگر پیرو آزاد ہوتا تو حسبِ حیثیت وہ بھی کرتا۔ لہذا سب کے لئے کپڑے بنائے جائیں۔ اس حکم کی بھی تعمیل ہوئی۔

الیاس نے یہ سوچ کر کہ تین روپئے سے زیادہ کا تو ایک وقت کا کھانا ہی ہو جاتا ہے، پیرو کو اپنے پاس سے تین روپے دیئے کہ سرکار کا قرض ادا کر دے اور پھر اسے صاحبزادہ صاحب کے سامنے پیش بھی کر دیا۔ فوراً سمجھ گئے کہ یہ الیاس کی حرکت ہے۔

بولے جیل کی کوٹھری میں تیرے پاس روپے کہاں سے آئے۔ پھر الیاس سے مخاطب ہوئے کہ تم سمجھتے ہو کہ ہم بیوقوف ہیں، اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ تین روپے کے عوض اس پر اور اس کے گھر والوں پر کتنا صرف ہو رہا ہے۔ اس کے بعد اپنے ہندو منیب کو بلایا اور کہا: منیب جی الیاس سے باورچی خانے کا انتظام لے کر کسی اور کے سپرد کر دو۔ ایسا بدنیت آدمی اگر باورچی خانے کا مہتمم ہو تو برکت نہیں ہوتی۔ چنانچہ پیرو کو جیل سے اور الیاس کو ملازمت سے رخصت کر دیا گیا۔

مہینوں بعد جب الیاس کی زوردار سفارش ہوئی تو اسے پھر ملازم رکھ لیا گیا، لیکن باورچی خانے کے بجائے اصطبل کا انتظام سپرد کیا گیا۔

صاحبزادہ محمد صدیق خان صاحب چوبیس گھنٹے میں صرف ایک وقت کھانا کھاتے تھے اور جب تک ساٹھ آدمی دسترخوان پر نہ ہوں لقمہ نہ اٹھاتے تھے۔ اگر ۵۹ آدمی بھی ہیں تو فرماتے تھے اللہ کی نیاز سے کسی اللہ کے بندے کو لاؤ۔ چنانچہ کسی بھی راہگیر کو بلا لیا جاتا تھا۔

صاحبزادہ صاحب کا کھانا عشاء کے بعد سے فجر کی اذان تک چلتا تھا۔ مختلف انواع و اقسام کے کھانے پک پک کر آتے رہتے تھے۔ اگر کسی نے کہہ دیا کہ سرکار اس وقت تو مُسلم بکرا ہوتا تو بڑا مزا آتا، اسی وقت بکرا ذبح کر کے بھونا جاتا تھا۔

صاحبزادہ افتخار علی خان صاحب

صاحبزادہ افتخار علی خان صاحب، نواب ابراہیم علی خان صاحب کے بیٹے تھے۔ لیکن ایک باندی سے، شکار کے بڑے شوقین تھے۔ میں نے انہیں جب بھی دیکھا کوٹ اور برجس ہی میں دیکھا، رائفلوں کا ان کے پاس بڑا اچھا ذخیرہ تھا۔ مانگنے پر دینا تو کجا، اگر کسی شخص نے کسی چیز کی تعریف بھی کر دی تو وہ اسی کو بخش دی، خواہ کتنی ہی بیش قیمت کیوں نہ ہو۔

ایک مرتبہ محلے کے برف فروش نے رمضان کے مہینہ میں برف کے دام دو پیسے کے بجائے ایک آنہ سیر کر دیئے۔ صاحبزادہ صاحب کو غصہ آگیا۔ خود برف منگوانے اور دو پیسے سیر فروخت کرانے لگے۔ برف والے نے بھی نرخ گرا دیا، وہ بھی دو پیسے سیر فروخت کرنے لگا۔ صاحبزادہ صاحب نے ایک پیسہ کر دیا تو اس نے بھی ایک پیسہ کر دیا۔ صاحبزادہ صاحب نے اعلان کر دیا کہ جو چاہے اپنی ضرورت کے مطابق برف مفت لے جایا کرے۔ صاحبزادہ صاحب تو جاگیردار تھے اور اس کا ذریعہ معاش ہی برف بیچنا تھا، ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ فرمایا: ہاں یہ ہوئی نا بات، جاؤ غیر رمضان کی طرح دو پیسے سیر فروخت کیا کرو اور خود برف کا سلسلہ ختم کر دیا۔

سال بھر تک صاحبزادہ صاحب کا کام مہاجنوں سے چلتا تھا اور جاگیر سے وصولیابی پر قرض ادا ہوتا تھا۔

ایک مرتبہ ایک فقیر نے صدا لگائی۔ صاحبزادے صاحب غصہ میں تھے اور ان دنوں ہاتھ بھی تنگ تھا۔ غصہ میں کہا کہ یہاں تو خود کھانے کو نہیں، آجاتے ہیں یہ مانگنے والے۔ فقیر نے کہا کہ میاں کھانے کو نہیں تو فقیر کی جھولی میں یہ سوکھے ٹکڑے ہیں یہ لے لو۔

چند ماہ بعد جاگیر کی آمدنی لے کر آرہے تھے کہ وہی فقیر راستے میں مل گیا۔ اسے روکا اور یہ کہا کہ کل تیرا دن تھا، آج میرا دن ہے۔ پوری رقم اسے دے دی اور خالی ہاتھ گھر واپس آگئے۔

انقلاب کے بعد ریاست بھی ختم ہوئی اور جاگیریں بھی اور اس طرح جاگیردار کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گئے۔

حکیم محمود احمد صاحب برکاتی نے مجھ سے بیان کیا کہ جن دنوں انہوں نے ٹونک میں مطب کھولا، صاحبزادہ صاحب انہی سے علاج کراتے تھے۔ ایک مرتبہ دوا لینے آئے۔ انہوں نے نسخہ لکھ دیا۔ دوسرے کمرے میں پہنچ کر انہوں نے دوا فروش ملازم سے نسخہ بندھوایا اور جانے لگے۔ ملازم نے کہا: آپ نے کل بھی پیسے نہیں دیئے تھے اور آج بھی پیسے دیئے بغیر جا رہے ہیں۔ یہ بات اندر برکاتی صاحب کے کانوں میں پڑی، دوڑ کر آئے، صاحبزادہ صاحب سے انتہائی معذرت کے ساتھ کہا: میاں آپ تشریف لے جائیں۔ پھر ملازم سے کہا: یہ بات تم کس سے کر رہے تھے، جانتے نہیں کہ کل تک ان کی فیاضی کا کیا حال تھا؟ آئندہ ان سے پیسے کبھی نہ لینا۔

جمالی صاحب

جمالی صاحب میرے دور کے سسرالی رشتہ دار محمود علی خان صاحب کے داماد تھے۔ گوالیار ان کا وطن تھا۔ نجوم، رمل، جوتش وغیرہ نہ معلوم کیا کیا فن جانتے تھے۔ سرونج میں میرا ہاتھ دیکھا تو کہا کہ سمندر کے کنارے واقع کسی بڑے شہر میں تمہاری سکونت ہوگی اور وہیں تمہاری قسمت کھلے گی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب پاکستان صرف ذہنوں میں تھا، دنیا کے نقشے پر ایک ملک کی حیثیت سے وجود میں نہ آیا تھا۔ واقعتہً ہوا بھی یہی کہ قسمت نے سرونج سے کراچی پہنچا دیا اور یہیں سے قسمت کھلنی شروع ہوگئی کہ حضرت مفتی شفیع صاحب کے دارالعلوم سے ایس۔ایم۔کالج منتقل ہوا، پھر سندھ یونیورسٹی، اس کے بعد کراچی یونیورسٹی اور وہاں سے مکہ مکرمہ کی ملک عبدالعزیز یونیورسٹی جو اب جامعہ ام القریٰ ہے۔

کراچی میں رہتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے تعلیم کو پی ایچ۔ڈی تک پہنچا دیا۔

کراچی پہنچنے کے ابتدائی دور میں جب میں حضرت مفتی محمد شفیع صاحب مرحوم کے پاس نائب مفتی کی حیثیت سے کام کرتا تھا، ایک روز جمالی صاحب دارالافتاء پہنچ گئے، جہاں میں تنہا بیٹھتا تھا۔ وہ بھی مستقلاً پاکستان چلے آئے تھے۔ ابتدائی صاحب سلامت کے بعد کہنے لگے کہ ایک پرچے پر کوئی نام لکھو۔ میں نے ڈیسک کی آڑ کرکے، کہ قلم کی روش بھی ان کی نظر میں نہ آئے، ایک کاغذ پر "ملکہ وکٹوریہ" لکھا۔ کہا کہ اس کے پرزے کر دو، پھر کہا کہ ماچس ہو تو اسے جلا دو۔ میں نے جلا دیا۔ راکھ لے کر ذرا فاصلہ پر چلے گئے اور اسے ہتھیلی پر رکھ کر دوسری ہتھیلی سے دو تین بار تھپتھپایا، پھر پینسل سے کاغذ پر کچھ حساب لگایا اور کہنے لگے کہ تم نے "ملکہ وکٹوریہ" لکھا تھا۔

جمالی صاحب نے حیدرآباد سندھ میں سکونت اختیار کی۔ قلعہ کے نیچے فٹ

پاتھ پر بیٹھ کر چار چار آنے میں لوگوں کی قسمت کا حال بتایا کرتے تھے۔

میرے دوست محمد یوسف اسحاقی صاحب مرحوم نے سوچا کہ ایسا باکمال شخص اگر کراچی میں ہو تو دولت کے انبار جمع کر سکتا ہے، کیونکہ کراچی میں دولت مند احمقوں کی کمی نہیں، چنانچہ وہ انہیں کراچی لے آئے اور اپنے مکان کی دوسری منزل پر ایک بڑا سا بورڈ پروفیسر جمالی کے نام کا بنوایا اور ایک فرنشڈ (Furnished) کمرے میں انہیں بیٹھا دیا۔ ان کا مکان ہاؤسنگ سوسائٹی میں شاہراہ فیصل پر واقع تھا، نیچے دوکانیں تھیں۔ جمالی صاحب جیسا ماہر فن ہو اور یوسف اسحاقی صاحب مرحوم جیسا ذہین اور کثیر الاحباب شخص ان کا ایجنٹ ہو تو گاہکوں کی کمی نہیں ہونی چاہئے۔ لیکن چند روز ہی گذرے تھے اور کاروبار جمنے بھی نہ پایا تھا کہ جمالی صاحب کی طبیعت کراچی سے اکتا گئی اور حیدرآباد واپس جا کر اسی فٹ پاتھ پر چار چار آنے میں ہاتھ دیکھنے لگے۔

دوسروں کی روشن قسمت بتانے والے کی خود کی تاریک قسمت کا حال کیا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیب دانی کے ہر فن کی نفی نہیں فرمائی بلکہ یہ تک فرمایا کہ ایک نبی ریت پر خطوط بنا کر غیب کا حال دریافت کیا کرتے تھے۔ جس کے خطوط ان کے موافق ہو جاتے ہیں ان کا جواب صحیح ہو جاتا ہے۔ اس حدیث میں اس علم کا ذکر ہے جسے علم رمل کہا جاتا ہے اور جو حضرت ادریس علیہ السلام کا معجزہ تھا۔

تاہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے لوگوں کے پاس جانے اور ان سے قسمت کا حال دریافت کرنے سے منع فرمایا ہے۔

حدیث میں ہے: **"من أتی کاہنا أو عرافا فلیس منا"** ٥

(جو کسی کاہن یا عراف کے پاس جائے وہ ہم میں سے نہیں)

کیونکہ اول تو یہ کہ " نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند " (ایسا نہیں ہے کہ جو شخص بھی سر منڈا لے وہ قلندری جانتا ہو) ہو سکتا ہے کوئی جاہل کسی کامل کا روپ دھار

کر لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لئے بیٹھ گیا ہو۔

اگر فن جانتا بھی ہو تو یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنے حساب کے ذریعہ جس نتیجے پر پہنچا ہے وہ صحیح ہی ہو۔ایک راجہ نے اپنے بیٹے کو غیب دانی کا فن سکھانے کے لئے کسی جوتشی کے حوالے کیا۔جوتشی کو جو کچھ آتا تھا سب کچھ سکھا کر وہ راجکمار کو راجہ کے پاس لایا۔راجہ نے اپنی انگوٹھی خاموشی سے اتار کر اپنی مٹھی میں دبالی اور راجکمار سے امتحاناً دریافت کیا کہ میری مٹھی میں کیا ہے۔اس نے حساب لگا کر جواب دیا: چکی کا پاٹ۔راجہ جوتشی سے مخاطب ہوا: کیا یہی سکھایا ہے تم نے؟جوتشی نے راجکمار سے پوچھا کہ تم نے یہ کیسے کہہ دیا، راجکمار نے کہا کہ میرے حساب نے یہ بتایا کہ ہاتھ میں کوئی ایسی گول چیز ہے جس کے بیچ میں سوراخ ہے اور اس سوراخ میں کوئی چیز پھنسی رہتی ہے۔میں نے سوچا کہ چکی کے پاٹ کے سوا اور کسی چیز کی یہ کیفیت نہیں۔وہ گول ہوتا ہے، اس کے بیچ میں سوراخ بھی ہوتا ہے اور اس میں کھونٹا بھی پھنسا ہوتا ہے جس سے پاٹ کو گھمایا جاتا ہے۔جوتشی نے کہا کہ تم نے جواب دینے سے پہلے یہ نہ سوچا کہ چکی کا پاٹ مٹھی میں کیسے آسکتا ہے؟راجکمار نے اپنی نادانی کا اعتراف کیا۔جوتشی نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا کہ حضور حساب تو ٹھیک تھا، اب یہ اپنی اپنی عقل و ذہانت ہے کہ کون کیا نتیجہ نکالتا ہے۔

اگر بالفرض نتیجہ صحیح بھی ہو تو غم کی خبر سے غم دوبالا ہو جاتا ہے۔جو غمناک واقعہ پیش آنے والا ہے وہ تو آئندہ اپنے وقت پر پیش آئے گا ہی، لیکن انسان اس کے خیال سے پہلے ہی سے گھلنے لگتا ہے۔بالفرض خود سائل کی موت کی خبر ہو تو کیا اس کی زندگی کے باقی ماندہ ایام موت سے بدتر نہ ہوں گے؟

ایک بادشاہ کا مٹاپا بڑھتا جارہا تھا۔کسی علاج سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ایک طبیب نے علاج کا بیڑا اٹھایا، حافظے میں یہ ہے کہ یہ ابو بکر رازی تھے، ممکن ہے کوئی اور ہوں۔طبیب نے کہا کہ علاج سے پہلے میں آپ کا زائچہ تو نکال لوں۔دوسرے روز

غمگین صورت بنا کر بادشاہ کے پاس پہنچے۔ بادشاہ نے پوچھا تو عرض کیا کہ حضور! نجومی نے بتایا کہ آپ کی زندگی کے صرف چالیس روز باقی رہ گئے ہیں۔ پھر علاج سے کیا فائدہ موٹے رہے تو کیا اور دبلے ہو گئے تو کیا۔ بادشاہ نے امور سلطنت چھوڑ کر مصلیٰ سنبھال لیا اور خور و نوش تک بقدر قوت لایموت رہ گئی۔ چالیسویں روز کا انتظار تھا، لیکن جب اکتالیسویں روز کا سورج طلوع ہو گیا تو طبیب کو بلوایا اور بھرے ہوئے انداز میں طبیب سے باز پرس کی۔ طبیب نے آئینہ سامنے کر دیا اور عرض کیا کہ حضور آپ یہی تو چاہتے تھے کہ دبلے ہو جائیں، دیکھیئے آپ کی کیا حالت ہو گئی اور اتنے دن کی عبادت کا ثواب نفع میں رہا۔ دواؤں سے علاج کیا جاتا تو یہ ثواب کیسے ملتا۔

اور اگر کوئی خوشخبری ہو تو خوشی ادھوری رہ جاتی ہے۔ فرض کیجئے اگر کسی طالب علم کو ٹیبولیٹر (نتیجہ مرتب کرنے والا) کے ذریعہ قبل از وقت معلوم ہو جائے کہ وہ پاس ہو گیا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ خوش ہو گا لیکن اس کی خوشی کی یہ کیفیت ہو گی کہ اعلان عام تو کیا شاید وہ اپنے قریبی دوست سے بھی اس کا اظہار نہ کر سکے۔ پھر جب نتیجہ شائع ہو کہ وہ پاس ہو گیا ہے تو وہ کہے گا کہ ہاں مجھے تو پہلے ہی معلوم تھا۔ نہ وہ خوشخبری سے قبل از وقت پورے طور پر لذت اندوز ہو سکا نہ وقت آنے پر۔

اس فن کے ماہرین کا کام صرف قسمت بتانا ہوتا ہے قسمت بنانا نہیں۔ جس کی قسمت میں جو ہے وہ اپنے وقت پر پیش آتا ہے۔ **"القدر خیرہ و شرہ من اللہ"** (اچھی اور بری تقدیر اللہ کی طرف سے ہے)، **"الأمور مرہون باوقاتہا"** (تمام کام اپنے وقت پر ہی ہوتے ہیں) اور اللہ کی بنائی ہوئی قسمت کو کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔

نہ معلوم کہاں پڑھا تھا اور نہیں معلوم کہ صحیح یاد بھی ہے یا نہیں۔ غالباً یونس نام کا کوئی یہودی ہے جس نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے کہا تھا کہ ہماری کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ سلطنت آپ کی نسل سے نکل کر دوسرے ہاتھوں میں جائے

گی اور ان میں سے ایک خلیفہ کے ہاتھوں سلطنت کو بڑی وسعت و قوت و شوکت نصیب ہو گی ۔ اس شخص کا حلیہ تک ہماری کتابوں میں لکھا ہوا ہے ۔ حضرت معاویہؓ نے عمائدین کو جمع کیا کہ ان میں سے کوئی شخص ہے؟ کہا کہ نہیں ۔ حضرت معاویہؓ نے اپنا آدمی ساتھ کیا کہ مکہ اور مدینہ جاکر دیکھو، کیونکہ ان ہی دو مقامات پر ایسا شخص ہو سکتا ہے جو خلیفہ بن سکے ۔ یونس مکہ پہنچا، عبدالملک بازار سے گذر رہا تھا (یا کسی مسجد میں بیٹھا تھا)، شبہ ہونے پر اسے روکا اور پہچان لیا کہ یہی وہ شخص ہے ۔ یونس نے کہا کہ اگر میں آپ کو کوئی بڑی خوشخبری سناؤں تو کیا آپ مجھے انعام دیں گے؟ عبدالملک نے جواب دیا کہ پہلے خبر سناؤ پھر انعام کی بات ہو گی ۔ اس نے بتایا کہ ایک روز آپ خلیفہ بنیں گے اور آپ کے ہاتھوں سلطنت کو اتنی وسعت ہو گی ۔ عبدالملک یہ سن کر جانے لگے ۔ یونس نے کہا کہ میرا انعام؟ عبدالملک نے کہا کہ اچھا یہ بتاؤ اگر میں تمہیں انعام دے دوں تو جو کچھ مجھے ملنے والا ہے کیا کچھ اس سے زیادہ مل جائے گا؟ کہا کہ نہیں ۔ پھر پوچھا کہ اگر میں انعام نہ دوں تو جو ملنے والا ہے اس میں کچھ کمی ہو جائے گی؟ جواب دیا کہ نہیں ۔ عبدالملک یہ کہہ کر چل دیا کہ یہی تمہارا انعام ہے ۔

واقعہ یہ ہے کہ قسمت کا حال بتانے والے قسمتیں بنا بھی سکتے تو جمالی صاحب فٹ پاتھ پر بیٹھ کر چار چار آنے میں ہاتھ کیوں دیکھتے ۔

۱۹۸۴ء میں جب میں تعطیلات میں پاکستان گیا اور حیدر آباد پہنچا تو جمالی صاحب بھی ملنے آئے ۔ بہت سی باتیں کیں، ان میں ایک یہ بری خبر بھی شامل تھی کہ آپ چار پانچ سال کے اندر اندر پاکستان واپس آجائیں گے، لیکن آپ اولاد کے محتاج نہ ہوں گے ۔ آپ کے پاس کم از کم ڈھائی تین لاکھ روپیہ ہو گا ۔ (اس واقعہ کو بارہ سال گذر چکے ہیں، میں بحمداللہ اب تک سعودیہ میں ملازم ہوں) ۔

جو شخص مکہ ہی کی زمین کا پیوند ہونا چاہتا ہو اس کے لئے یہ خبر اچھی کیسے ہو سکتی ہے ۔ لیکن "بای أرض تموت" (کس زمین میں موت آئے گی) کی خبر کسے

ہے۔

امام مالک رحمتہ اللہ علیہ بقیع میں دفن کے متمنی تھے، اسی لئے اس اندیشے سے کہ کہیں مدینہ سے باہر موت نہ آجائے حج کے سوا مدینہ سے کبھی باہر نہیں گئے۔ ان کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اگر مجھے اپنی موت کا وقت معلوم ہو جاتا تو میں مدینہ سے باہر جا کر ان تابعین سے بھی استفادہ کر سکتا جو مدینہ سے باہر قیام فرما ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے ایک مرتبہ خواب دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی پانچ انگلیاں انہیں دکھا رہے ہیں۔ حضرت ابن سیرین نے جو خواب کی تعبیر کے ماہرین میں سے تھے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علہ وسلم کا ارشاد قرآن کریم کی ان آیات کی طرف تھا جن میں فرمایا گیا ہے کہ پانچ باتوں کی خبر اللہ کے سوا کسی کو نہیں اور انہی میں سے ایک یہ ہے کہ کوئی نہیں جانتا کہ اس کی موت کہاں آئے گی۔ (ان اللہ عندہ علم الساعة.....)

سائیں سلیمان شاہ بجنوری

جس زمانہ میں بنیا پن اختیار کیا ہوا تھا اسی زمانے کا واقعہ ہے کہ سرونج میں ایک صاحب تشریف لائے: سائیں سلیمان شاہ بجنوری۔ گدرائی عمر، سرمئی رنگ، سیاہ ڈاڑھی اور نصف پنڈلیوں تک کا سیاہ کرتا۔ کون سا ضعیف الاعتقاد ہے جو اس ہیئت سے مرعوب نہ ہو اور سرونج کی اکثریت ضعیف الاعتقاد مسلمانوں ہی پر مشتمل تھی۔ ضعیف الاعتقادی کے لئے جہالت کی تخصیص نہیں۔ اچھے خاصے تعلیم یافتہ حضرات کو بھی اس نامراد مرض میں مبتلا دیکھا ہے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو مجھ جیسا شخص کیوں ان کا معتقد ہوتا جو دارالعلوم دیوبند سے فراغت، مولوی فاضل منشی فاضل اور میٹرک کی اسناد اپنی پشت پر لاد چکا ہو، اس طرح کہ؛

چار پائے برو کتابے چند
نہ محقق شود نہ دانشمند

(چوپایہ جس پر چند کتابیں لدی ہوں، نہ وہ محقق ہوتا ہے نہ دانشمند)

علم جب تک دل و دماغ میں داخل نہ ہو اور عمل میں سرایت نہ کرے گدھے کی پیٹھ کا ایک بوجھ ہی ہوتا ہے۔

بہرحال ان کے معتقدین کی فہرست میں، میں بھی داخل ہو گیا اور چونکہ سب سے زیادہ تعلیم یافتہ تھا، لوگ مولوی اور ہائی اسکول کے سابق ٹیچر کی حیثیت سے جانتے تھے۔ اس لئے دوسروں کو ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونے کی مزید ترغیب ہوئی، کیونکہ مولوی جب گڑھے میں گرتا ہے تو تنہا نہیں گرتا۔

دو چار ہی روز ہی گذرے تھے کہ مقربِ خاص بن گیا اور دوکان کو تالا لگا کر، سونے کے اوقات کے علاوہ ہمہ وقت ان کے ساتھ رہنے لگا۔ حد یہ تھی کہ بیڑی وہ پیتے

تھے اور سلگا کر میں دیا کرتا تھا۔

ان کے جو حالات دیکھنے میں آئے وہ عام آدمی کو ان کا اسیر بن جانے کے لئے کافی تھے۔

۱... حلقہ ارادت جما ہوا ہے۔ بجنوری صاحب کی مجذوبانہ بڑ جاری ہے، جس میں کچھ ہوش کی باتیں بھی ہیں۔ بیڑی کا بنڈل اور ماچس میرے پاس ہے اور ان کی Chain Smoking کے لئے ماچس ذرا ذرا سے وقفے سے استعمال کر رہا ہوں۔ سامنے سے ریوڑی والا گذرتا ہے۔ پوچھتے ہیں خوانچہ میں کتنے کی ریوڑیاں ہیں؟ کہا پانچ روپے کی۔ فرمایا بچوں کو تقسیم کر دو اور جب اس نے تقسیم کر دیں تو ماچس میرے سامنے سے اٹھا کر اسے دے دی۔ اب جو وہ کھول کر دیکھتا ہے تو اس میں پانچ روپے رکھے ہیں۔

۲... ایک جلسہ کراتے ہیں۔ خود صدر مقام سے دور بیٹھ جاتے ہیں۔ پہلے تلاوت ہوتی ہے، تلاوت کے بعد اپنی جگہ سے اٹھتے ہیں۔ سیاہ کرتے کی چوڑی چوڑی جھلنگا سی آستینیں ہلاتے ہوئے آتے ہیں۔ سب دیکھ رہے ہیں کہ ہاتھ خالی ہیں۔ قاری کے سامنے پہنچ کر نذر پیش کرنے کے انداز میں جھکتے ہیں اور لوگ دیکھتے ہیں کہ دس روپے کا کرارا نوٹ ان کی ہتھیلی پر رکھا ہوا ہے۔

تلاوت کے بعد مجھ سے ترجمے کے لئے کہا گیا۔ ارشاد کی تعمیل ہوئی۔ حسب سابق ہاتھ ہلاتے ہوئے آئے اور اس مرتبہ ہتھیلی پر وکٹوریہ کے زمانے کا کلدار روپیہ رکھا ہوا تھا۔ وہ روپیہ تقریباً ڈیڑھ ماہ تک میری اس تھیلی میں رہا جس میں دوکان کی آمدنی رکھا کرتا تھا۔ پھر میں نے اسے ایک روپیہ سات آنے میں فروخت کر دیا۔ اس میں رائج روپیہ کے مقابلے میں چاندی کی مقدار زیادہ ہوتی تھی۔

البتہ اس بات پر حیرت ہوئی کہ جب میرے سسر کی درخواست پر وہ ریاض المدارس تشریف لے گئے تو وہاں جو انہوں نے پچیس روپئے نذر کئے وہ مجھ سے لے کر

نذر کیئے۔ دستِ غیب کے ماہر نے نہ معلوم ایسا کیوں کیا؟

ریاض المدارس سے قیام گاہ پر پہنچ کر موصوف نے صاحب خانہ سے کہا کہ زنانخانے میں جاؤ اور فلاں طاق سے پچیس روپے لاکر انہیں دے دو۔ چنانچہ مجھے پچیس روپے مل گئے۔

۳۔۔۔ سرونج میں ان کے قیام کی آخری رات تھی، عبدالحی صاحب کو توال کے مکان پر عشائیہ کے لئے مدعو تھے، میں بھی موجود تھا کیونکہ ہر دعوت میں مقربِ خاص کی ہمراہی ضروری تھی۔ کھانے کے بعد قاسم گھڑی ساز نے موصوف کے ساتھ چند آدمیوں کو چائے پر مدعو کیا تھا۔ لیکن قاسم کے مکان کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ لوگوں کا جمِ غفیر ہمراہ ہے۔ تعداد ساٹھ ستر سے کم نہ ہوگی۔ سب کو مخاطب کر کے فرمایا" بھائیو! میزبان نے صرف چار پانچ آدمیوں کو بلایا ہے۔ پھر قدرے خاموشی کے بعد فرمایا کہ اچھا سب چلو، دیکھا جائے گا۔ میزبان کے گھر پہنچ کر وہ میزبان کے ہمراہ زنانہ حصہ میں گئے اور واپس آکر سب کے ساتھ بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد چائے آنی شروع ہو گئی اور ساٹھ ستر آدمیوں نے دو دو پیالیاں پیں۔

(بعد میں قاسم نے مجھے بتایا کہ سائیں نے اپنا لعاب دہن دیگچی میں ڈالا، اسی سے یہ برکت ہوئی)۔

وہ رات سائیں صاحب نے قاسم کے مکان پر ہی گذاری۔ جیسے جیسے رات بھیگتی گئی لوگ رخصت ہوتے گئے، یہاں تک کہ فجر سے قبل منشی عبدالعزیز صاحب بھی صبح اسکول جانے کی وجہ سے رخصت ہو گئے۔ منشی عبدالعزیز صاحب سعادت ہائی اسکول سرونج میں فارسی کے استاد تھے اور سائیں صاحب سے تقرب میں میرے بعد انہیں کا درجہ تھا۔ جب میں، قاسم اور سائیں صاحب رہ گئے تو سائیں صاحب نے قاسم کو اندر جانے کا حکم دیا۔ پھر مجھ سے فرمایا کہ مانگو کیا مانگتے ہو۔ میں نے کہا کہ نیکی کی توفیق اور خاتمہ بالخیر کے سوا کوئی طلب نہیں۔ فرمایا کچھ اور؟ تین بار یہ سوال کیا اور

تینوں بار میں نے ایک ہی جواب دیا۔ انہوں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔ دعا ختم ہوئی تو قاسم کو آجانے کی اجازت دے دی۔

۴.... کئی بار ایسا ہوا کہ کسی نے تعویذ کی درخواست کی۔ انہوں نے فضا میں اپنا ہاتھ پھیلا دیا۔ سب حاضرین کے ساتھ میں نے خود دیکھا کہ تعویذ فضا میں ایک گز کے فاصلہ سے ان کے ہاتھ کی طرف چلا آرہا ہے۔ ایسا بھی ہوا کہ کسی کی درخواست پر تعویذ فضا سے آرہا ہے اور اسی درمیان میں کسی نے کہہ دیا کہ حضور مجھے بھی۔ انہوں نے اسی ایک تعویذ کے دو کئے (دو ٹکڑے نہیں دو تعویذ) اور دونوں کو دے دیئے۔

۵.... جن دنوں سائیں سلیمان کا سرونج میں قیام تھا، سرونج کے مفتی صاحب، حضرت قبلہ عبدالجید صاحب شہر میں نہ تھے۔ سائیں کی روانگی سے دو روز قبل واپس تشریف لے آئے۔ منشی ولایت محمد خان صاحب نے دونوں حضرات کو کھانے پر مدعو کر لیا۔ اس روز سائیں صاحب کی حالت قابلِ دید تھی۔ وقتِ مقررہ سے کئی گھنٹے قبل سے ان کی مجذوبیت میں خرد کے مقابلے میں جنوں کا پہلو غالب آگیا تھا۔ میزبان کے گھر پہنچ کر جب حضرت مفتی کی تشریف آوری کا انتظار کیا جارہا تھا، ان کی مجذوبانہ کیفیت میں اور اضافہ ہو گیا۔ یہاں تک کہ جب یہ اطلاع آئی کہ مفتی صاحب تشریف نہیں لائیں گے تو ان کے اضطراب میں کمی ہوئی، چہرے پر مسرت و اطمینان کے آثار نمودار ہوئے اور زبان سے یہ کلمات نکلے "جہاں شیر ہوں وہاں لومڑیاں نہیں آتیں"۔

غرض یہ کہ اس طرح کے متعدد واقعات تھے، اور اس طرح کے واقعات جب پیش آتے ہیں تو اچھے خاصے تعلیم یافتہ، روشن خیال یا راسخ العقیدہ لوگوں کے قدم بھی ڈگمگا جاتے ہیں۔

سائیں صاحب کے جانے کے بعد رفتہ رفتہ ہوش آنے لگا اور جیسے جیسے عقل ٹھکانے آتی گئی ان کی بزرگی کا رعب اترتا گیا۔ جس کے صبح و شام میں ذکر و شغل اور نوافل تو کیا ہوتے، جو فرض نمازیں بھی ترک کر دیتا ہو وہ بزرگ کیسے ہوا۔ اور پھر خیال ہوا کہ کاش میں نے ان سے نیکی کی توفیق اور خاتمہ بالخیر کے بجائے شمع معمہ کا

حل دریافت کیا ہوتا، جس کی انعامی رقم ایک لاکھ تک پہنچ گئی تھی، بشرطیکہ تقسیم ایمانداری سے ہوتی ہو۔

ایک روز سرونج کے مفتی صاحب حضرت قبلہ عبدالمجید صاحب سے ملاقات ہوئی۔ سائیں صاحب کا ذکر کیا اور اپنا بھی خیال ان کے سامنے ظاہر کیا کہ ایسے شخص کا بزرگی سے کیا تعلق۔ فرمایا: ہاں میاں سچ کہتے ہو، بعض مرتبہ کوئی شخص کسی سفلی عمل کے ذریعہ کوئی خبیث روح تابع کر لیتا ہے اور اس کے ذریعہ اس طرح کے شعبدے دکھاتا رہتا ہے۔ فرمایا: دور کیوں جاؤ، بگرودہ (سرونج کے قریب ایک گاؤں) کے اندھے برہمن کو جا کر دیکھ لو۔ جب لوگوں کو کوئی کنواں کھودنا ہوتا ہے اسے لے جاتے ہیں۔ وہ صرف مٹی سونگھ کر بتا دیتا ہے کہ اتنی گہرائی پر پانی نکلے گا اور کھودنے میں اس رنگ کی مٹی کے پرت نکلیں گے اور ایسا ہی ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ میں نے (مفتی صاحب نے) اس سے دریافت کیا کہ تو کیسے بتا دیتا ہے، تو اس نے کہا کہ حضور میں کچے کلوے کا عامل ہوں، اسی سے پوچھ کر بتاتا ہوں اور کچے کلوے کو قابو میں رکھنے کے لئے مجھے روزانہ اپنے پہلے پیشاب کا ایک چلو پینا پڑتا ہے اور پہلے پاخانہ سے ایک انگلی چاٹنی پڑتی ہے۔

شاید سائیں سلیمان بھی کسی سفلی عمل کے عامل تھے، کیونکہ بزرگوں کے اوقات اس طرح کے نہیں ہوتے جس طرح سائیں صاحب کے تھے۔ اولیاء اللہ اس طرح کے کشف و کرامات بھی ہر وقت ظاہر نہیں فرماتے۔ حقیقی ولی تو کشف و کرامت کو اس طرح چھپاتا ہے جس طرح خواتین اپنے مخصوص نجس کپڑے کو چھپاتی ہیں۔ ان سے کوئی کرامت ظاہر ہوتی بھی ہے تو یا تو ضرورت کے موقع پر یا غیر اختیاری طور پر۔

عادت کے خلاف کوئی بات، جسے اصطلاحاً خرق عادت کہتے ہیں، اگر کسی نبی سے تحدی یا چیلنج کے ساتھ ظاہر ہو تو اسے معجزہ کہتے ہیں۔ نبی کے کسی سچے متبع کے ہاتھوں ظاہر ہو تو کرامت کہلاتی ہے اور اگر کافر یا فاسق کے ذریعہ ظاہر ہو تو اسے

استدراج کہتے ہیں۔

غیر نبی سے خوارق عادات کا ظہور کبھی شدید ریاضتوں کے نتیجے میں ہوتا ہے اور کبھی کسی عمل کے نتیجے میں۔ یہ عمل علوی بھی ہوتا ہے اور سفلی بھی۔ کوئی کچھ کلوے جیسی خبیث ارواح کو تابع کرکے خرق عادت دکھاتا ہے اور کوئی مؤکلوں کو تابع کرکے۔

حضرت شاہ محمد غوث گوالیاری کا واقعہ یاد آرہا ہے کہ مریخ کو تابع کرنے کے لئے چلّے میں بیٹھے تھے (اسی طرح پڑھا ہے، واللہ اعلم) اور اپنے تابع مؤکلوں کو ہدایت دے رکھی تھی کہ اگر کوئی کامل گوالیار آئے تو اطلاع کرنا۔ شطاری سلسلے کے ایک بزرگ خواجہ محمد منظور گوالیار پہنچے اور قلعے کے نیچے ایک مسجد میں قیام فرمایا۔ مؤکلوں نے خبر دی۔ آقا نے کہا کہ میں چلّے سے کیسے اٹھ سکتا ہوں، جاؤ انہی کو اٹھا لاؤ۔ مؤکلوں نے جواب دیا کہ ہم تو ان کے جسم کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے۔ فرمایا: اچھا اس مسجد ہی کو یہاں اٹھا لاؤ۔ جب مسجد نے ذرا جنبش کی تو خواجہ محمد منظور نے زمین تھپتھپا کر فرمایا! کیوں ہلتی ہے؟ مسجد اپنی جگہ جم گئی۔ پھر انہیں تنبہ ہوا کہ یہ مؤکلوں کی حرکت تھی۔ سب کو سامنے بلایا اور وجہ دریافت کی تو انہوں نے واقعہ بیان کر دیا۔ حکم دیا کہ محمد غوث کو یہاں اٹھا لاؤ۔ مؤکلوں نے جب شاہ محمد غوث کو یہ حکم سنایا تو انہوں نے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے، میں چلّے میں ہوں اور تم میرے تابع ہو۔ مؤکلوں نے جواب دیا: آپ چاہیں تو ہماری جان لے سکتے ہیں، لیکن ان کا حکم نہیں ٹل سکتا۔ چنانچہ اٹھایا اور لے جا کر مسجد میں بٹھا دیا۔

خواجہ محمد منظور نے فرمایا: میاں! اللہ نے انسان کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ اس کا بندہ بن کر رہے، نہ اس لئے کہ دوسروں کو اپنا بندہ بنائے۔

یہ کہہ کر توبہ کرائی اور سارے مؤکلوں کو آزاد کرایا۔ صدق مقال، اکل حلال اور تقویٰ تو پہلے سے موجود تھا، نسبت دی تو فرش سے عرش پر پہنچا دیا۔ کہتے ہیں کہ شاہ محمد غوث گوالیاری اپنے نام ہی کی طرح اپنے زمانے کے غوث ہوئے ہیں۔

شوکت مجذوب

اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کے دو نظام کار فرما ہیں ۔ ایک نظام تشریع، دوسرا نظام تکوین ۔ ہر نظام کے لئے اللہ تعالیٰ نے علحدہ علحدہ افراد پیدا فرمائے ہیں ۔ تشریعی نظام انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ چلتا ہے اور تکوینی نظام کا کام دوسروں سے لیا جاتا ہے ۔

ان دونوں قسم کے نظاموں اور دونوں کے لئے رجالِ کار کی تفریق کا پتہ ہمیں قرآن کریم سے حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کے واقعہ سے چلتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تشریع کے آدمی ہیں اور حضرت خضر علیہ السلام تکوین کے اور دونوں میں سے کسی ایک کو دوسرے کی خبر نہیں ۔ حضرت موسیٰؑ کی معیّت میں حضرت خضرؑ تین تکوینی کام کرتے ہیں اور حضرت موسیٰؑ جو تشریع کے آدمی ہیں تینوں پر اعتراض فرماتے ہیں ۔ تیسرے کام پر اعتراض کے بعد حضرت خضرؑ، حضرت موسیٰؑ کو رخصت کرتے ہیں تو اپنے تینوں کاموں کی حکمت بیان کرتے ہوئے یہ بھی فرماتے ہیں کہ یہ کام میں نے اپنی طرف سے نہیں کئے (بلکہ اللہ کے حکم سے کئے ہیں) ۔

اللہ تعالیٰ نظام تکوین کے لئے جو افراد مقرر فرماتا ہے بسا اوقات ان سے عقل سلب فرما لیتا ہے، تاکہ وہ شرعی تکلیفات (اللہ اور بندوں کے شرعی حقوق) کے پابند نہ رہیں اور صرف تکوینی امور کی انجام دہی میں مصروف رہیں، کہ یہی ان کی عبادت ہے ۔ ایسی ہی لوگوں کو مجذوب کہا جاتا ہے ۔ لیکن اربابِ بصیرت کے سوا کسی اور کا دیوانے اور مجذوب میں فرق کرنا بہت دشوار ہے ۔ شوکت صاحب، جن کا ذکر میں کرنا چاہتا ہوں ان کے بارے میں تقریباً یقین ہے کہ وہ مجذوب تھے، محض دیوانے نہ تھے ۔

شوکت صاحب کو میں نے دیکھا ہے، گولی مار (گلبہار کالونی) کی ایک کوٹھری میں رہتے تھے ۔ یہ تقریباً ۱۹۶۰ء کی بات ہے ۔ میں نے انہیں بغیر کمر بند کا پائجامہ پہنے اور

نیفے پر سے اپنے بائیں ہاتھ سے سنبھالے دیکھا ہے اور وہ کوٹھری بھی دیکھی ہے جس میں وہ رہا کرتے تھے۔ لیکن ان کے جو واقعات ذیل میں ذکر کر رہا ہوں، وہ حاجی محمد اعلیٰ صاحب کے بیان کردہ ہیں، جو انہیں خوب جانتے تھے۔

شوکت صاحب، کے۔پی۔ٹی، کراچی میں کمپونڈر تھے۔کے۔پی۔ٹی کے گیٹ کے باہر ایک مجذوب بیٹھا رہتا تھا، شوکت صاحب اس کی خدمت کرتے رہتے تھے۔وہ مجذوب بغیر کمربند کا پائجامہ بائیں ہاتھ سے نیفے پر سے سنبھالے رہتا تھا۔

ایک روز شوکت صاحب نے مجذوب کو چائے لا کر دی۔اس نے تھوڑی سی پی اور باقی شوکت صاحب کو یہ کہہ کر دی کہ اسے پی لو۔شوکت صاحب نے پی لی۔اس کے بعد سے ان کی حالت میں تغیّر شروع ہوا اور رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ مجذوب تو رخصت ہو گیا اور شوکت صاحب نے اس کی جگہ سنبھال لی۔

ایک مرتبہ میں حاجی محمد اعلیٰ صاحب اور حضرت شاہ زوّار حسین صاحب گولیمار میں حکیم شجاعت علی صاحب کے پاس گئے تو شوکت صاحب کو حکیم صاحب کے مطب کے باہر چبوترے پر بیٹھے دیکھا۔حاجی صاحب نے بتایا کہ یہی ان کی مستقل بیٹھک تھی۔نہیں معلوم کہ انہوں نے کے۔پی۔ٹی کا گیٹ چھوڑ کر کب سے یہ بیٹھک اختیار کر لی تھی۔

شوکت صاحب کبھی کبھی گنگناتے بھی تھے اور عام طور پر ان کی مجذوبانہ بڑ سمجھ میں نہ آتی تھی، اگرچہ گاہے گاہے بہت صاف اردو بھی بول لیتے تھے۔وہ کبھی کبھی لکھا بھی کرتے تھے اور حاجی اعلیٰ صاحب، جو خود بھی خوش نویس ہیں، فرماتے ہیں کہ ان کا خط بڑا پاکیزہ اور انتہائی باریک ہوا کرتا تھا۔حکیم صاحب کی دوکان پر آکر بیٹھنے کے بعد وہ نہایت باریک خط میں بسم اللہ اور اس کے بعد چار مصرعے لکھتے تھے اور اس کے نیچے دستخط کر دیا کرتے تھے، تاریخ بھی لکھتے تھے۔

حکیم صاحب کو اولیاء اللہ اور مجذوبوں سے بڑا ربط تھا۔ایک مرتبہ حکیم صاحب نے شوکت صاحب سے فرمائش کی کہ اپنے سردار کی زیارت تو کرائیں۔سن کر خاموش

ہو گئے ۔ ایک روز ایک پٹھان کا رکشہ مطب کے سامنے رکا ۔ شوکت صاحب نے حکیم صاحب سے کہا: چلو چلو تمھیں سردار کی زیارت کراؤں ۔ حکیم صاحب نے مطب بند کیا اور رکشا میں بیٹھ کر دونوں روانہ ہو گئے ۔ نیٹی جیٹی کا پل پار کر کے ایک جگہ پہنچے، شوکت صاحب نے رکشہ رکوایا، نیچے اترے اور اشارے سے ایک ٹیلے پر بیٹھے سر پر عمامہ باندھے ایک بزرگ کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ وہ ہمارا سردار بیٹھا ہے، یہ کہہ کر شوکت صاحب بھاگ گئے ۔ حکیم صاحب سردار کے پاس گئے، ان کے پاس مریم بھی تھی، جو کیماڑی میں بیٹھی رہتی تھی اور مشہور تھا کہ وہ بھی مجذوبہ ہے ۔ حکیم صاحب نے قریب پہنچ کر سردار کو سلام کیا ۔ انھوں نے سلام کا جواب دیا اور کہا چلو چلو، تم بھی کس دیوانے کی باتوں میں آ گئے ۔ مریم نے کہا: آپ یہاں بھی آ گئے ۔ حکیم صاحب واپس آ گئے ۔

ایک مرتبہ حاجی محمد اعلیٰ صاحب اور ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب، حکیم صاحب کے پاس گئے ۔ بیچ فرش میں شوکت صاحب بیٹھے تھے ۔ حکیم صاحب نے شوکت صاحب سے کہا: تم اوپر کرسی پر بیٹھ جاؤ ۔ یہ سنتے ہی شوکت صاحب آگ بگولہ ہو گئے اور کہنے لگے ؛ تم نے سمجھا کیا ہے، یہ کر دوں گا، وہ کر دوں گا، تمھاری قبر بنا دوں گا ---
دو سال بھی نہ گذرے تھے کہ حکیم صاحب کو فالج ہو گیا اور بارہ سال بعد اسی فالج میں ان کا انتقال ہوا ۔

حاجی اعلیٰ صاحب بیان کرتے ہیں کہ ایک روز میری شوکت صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے ان سے کہا کہ بھائی شوکت! دیکھو تو اپنے حکیم صاحب کو کیا ہو گیا ہے ۔ صاف اردو میں کہنے لگے: میں کیا کر سکتا ہوں ۔

حاجی اعلیٰ صاحب نے ایک روز شوکت صاحب سے دریافت کیا کہ ان کی بیوی کا قاتل اس وقت کیا کر رہا ہے ؟ کہنے لگے: جھاڑو دے رہا ہے ۔ حاجی صاحب کی اہلیہ کا قاتل ایک بھنگی تھا ۔ اس واقعہ کی تفصیل "مولانا عبدالغفور صاحب عباسی" کے ذکر میں ہے ۔

ہلّو بی

ہلّو بی ٹونک کی ایک مشہور مجذوبہ تھیں ۔ کتے پالتیں اور ہمیشہ ننگی رہتی تھیں ، لیکن حکیم برکات احمد صاحب نواب صاحب کے پاس جاتے ہوئے ادھر سے گذرتے تو سامنے آنے سے پہلے چلاتیں " کپڑے لاؤ ، کپڑے لاؤ ، مرد آرہا ہے " اور جب تک حکیم صاحب گذر نہ جاتے ، بدن ڈھانپے رکھتیں ۔

یاد آیا کہ کسی عارف نے دنیا کو خواب میں ایک دوشیزہ کی شکل میں دیکھا ۔ دریافت کیا کہ اتنے خصموں کے ہوتے تو اب تک دوشیزہ کس طرح ہے ۔ جواب دیا کہ جو مرد تھے انہوں نے آج تک ہاتھ نہیں لگایا اور جنہوں نے ہاتھ لگایا وہ سب نامرد تھے ۔

دو جن عورتیں

حاصل پور میں ایک حکیم صاحب تھے، حکیم مولا بخش مرحوم۔ان کا ایک واقعہ مجھے حضرت شاہ زوّار حسین صاحب مرحوم نے سنایا کہ ایک روز حکیم صاحب مطب کر رہے تھے کہ دو برقعہ پوش عورتیں چہروں پر نقاب ڈالے مطب میں آکر بیٹھ گئیں۔ جب ان کی باری آئی تو انہوں نے کہا کہ تمام مریضوں کے بعد ہم اپنا حال سنائیں گے۔ جب تمام مریض جا چکے تو انہوں نے اپنے نقاب الٹ دیئے۔ حکیم صاحب کہتے تھے کہ میں نے اپنی زندگی میں اتنی خوبصورت عورتیں نہیں دیکھی تھیں۔انہوں نے کہا کہ ہم جن عورتیں ہیں۔اس طرف سے گذر رہے تھے کہ آپ کو بیٹھے دیکھا، سوچا کہ آپ سے مل بھی لیں۔ہم دلّی میں آپ کے مطب میں آیا کرتے تھے۔

حکیم صاحب نے ان سے دریافت کیا کہ پاکستان کیسے آنا ہوا تو انہوں نے جواب دیا کہ جس طرح کافروں اور مسلمانوں کی آبادیوں کے تبادلے ہوئے ہیں اسی طرح کافر اور مسلمان جنّات میں آبادی کا انتقال ہوا ہے۔ہم چونکہ مسلمان تھے اس لئے پاکستان آگئے۔

جے پور کا ایک راجہ

میرے استاد مولانا منتخب الحق صاحب مرحوم نے مجھے یہ واقعہ سنایا کہ جے پور کا ایک وارثِ تخت (شاید مادھو سنگھ) ریاست بدر کر دیئے جانے کی وجہ سے ٹونک میں پناہ گزین تھا۔ نواب ابراہیم علی خان کی عنایات اور مسلمانوں کے درمیان کئی سال زندگی گزارنے کی وجہ سے اس کے دل میں مسلمانوں کی طرف سے نرم گوشہ پیدا ہو گیا تھا۔ اپنے پیشرو کے انتقال پر وہ تخت کا وارث ہوا اور جے پور جا کر گدی سنبھال لی۔

جے پور ایک خوبصورت شہر ہے۔ کشادہ سڑکیں، سیدھی سیدھی گلیاں کہ ہر گلی دونوں سروں پر کسی شاہراہ سے ملتی ہے۔ لیکن بعض سڑکوں کے بالکل وسط میں ہندوؤں نے مندر بنا دیئے ہیں۔

ایک مرتبہ ایک خان صاحب کو غصہ آیا اور انہوں نے ایک مورتی کی گردن توڑ دی۔ پنڈتوں نے راجہ کے سامنے مقدمہ پیش کیا۔ راجہ نے حیرت اور غصّے کا اظہار کرتے ہوئے پنڈتوں سے دریافت کیا کہ اس کی کیا سزا ہونی چاہیے؟ انہوں نے جواب دیا کہ مہاراج! جس نے بھگوان کی مورتی توڑی ہے اس کی سزا یہ ہونی چاہیے کہ اس کی مورتی توڑ دی جائے۔ راجہ نے کہا کہ تم ٹھیک کہتے ہو، لیکن آج ہمیں بہت غصہ ہے اور غصے میں صحیح فیصلہ نہیں ہوتا۔ اس لئے اسے قید کر دیا جائے اور پندرہ روز بعد دوبارہ یہ مقدمہ ہمارے سامنے پیش کیا جائے۔

پندرہ روز بعد مقدمہ دوبارہ پیش ہوا۔ راجہ کے دریافت کرنے پر پنڈتوں نے اپنا سابق جواب دہرایا کہ سزا میں اس کی مورتی توڑ دی جائے۔ راجہ نے مصنوعی غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ آج بھی ہمیں سخت غصہ ہے اور اس حالت میں ہم صحیح فیصلہ

نہیں کر سکتے۔ پندرہ روز بعد یہ مقدمہ پھر ہمارے سامنے پیش کیا جائے۔

اس عرصے میں راجہ نے خان صاحب کے اعرہ کو بلا کر پانچ سو اشرفیاں دیں اور کہا کہ میں جرمانہ کروں تو فوراً یہ اشرفیاں پیش کر دی جائیں۔

تیسری بار جب مقدمہ پیش ہوا تو راجہ نے کہا، آج ہماری طبیعت پر سکون ہے، آج ہم اس مقدے کا فیصلہ کریں گے۔

راجہ: ہاں پنڈت جی، اس کی کیا سزا ہونی چاہیے؟

پنڈت جی: مہاراج! اس نے بھگوان کی مورتی توڑی ہے۔ اس کی سزا یہ ہونی چاہیے کہ اس کی مورتی توڑ دی جائے۔

راجہ: بھگوان کی مورتی کیا دوبارہ بن سکتی ہے؟

پنڈت جی: ہاں مہاراج، انسان ہی کی بنائی ہوئی تھی، دوبارہ بھی بن سکتی ہے۔

راجہ: اور اگر اس شخص کی مورتی توڑ دی جائے تو کیا یہ دوبارہ بن سکتی ہے؟

پنڈت جی: مہاراج! یہ تو بھگوان کی بنائی ہوئی مورتی ہے، اسے دوبارہ کون بنا سکتا ہے۔

راجہ: اپنا انصاف یہ نہیں کہتا کہ جو مورتی دوبارہ بن سکتی ہے اس کے بدلے میں وہ مورتی توڑ دی جائے جسے دوبارہ نہیں بنایا جا سکتا۔ لیکن (مصنوعی غصے کا اظہار کرتے ہوئے) اس نے بہت بڑا جرم کیا ہے۔ میں اس پر پانچ سو اشرفیاں جرمانہ کرتا ہوں، تاکہ مورتی دوبارہ بنوائی جا سکے اور اگر اسی وقت جرمانہ ادا نہ کیا گیا تو گردن اڑا دوں گا۔

اعرہ نے فوراً اشرفیاں پیش کر دیں۔

متفرقات

کراچی میں برائٹ پرنٹرز کے مالک نے ایک مرتبہ حسبِ ذیل واقعات سنائے:

○ --- ہماری دوکان بمبئی میں تھی - وہاں ایک مشہور موالی تھا - اسے حج کی سوجھ گئی - ہر ایک کو روک روک کر کہتا میں حج پر جارہا ہوں، میں نے تمہیں بہت ستایا ہے، مجھے معاف کر دو - حج کو آیا، مدینہ منورہ گیا لیکن مسجد نبوی کے اندر جانے کی جرأت نہ کی - باہر سڑک پر ٹہلتا جاتا تھا کہ میں تو اتنا گنہگار ہوں حضورؐ کو کیسے منہ دکھاؤں - بالآخر وہیں سڑک پر گرا اور روح پرواز کر گئی -

----

○ --- رحیم یار خان میں ایک باؤلا سا ہے - لوگ اس کا مذاق اڑاتے رہتے ہیں - ایک مرتبہ وہاں کے کچھ متمول اہلحدیث تاجر حج پر جانے لگے تو مشورہ ہوا کہ اسے بھی ساتھ لے لیں، کام بھی کر دیا کرے گا اور دلچسپی بھی رہے گی - چنانچہ ساتھ لے گئے - حج کے بعد مدینہ منورہ گئے اور جب مدینہ منورہ سے جدہ آنے لگے، سامان گاڑی میں رکھ دیا، تو کسی نے اس سے مذاق میں کہا کہ ارے فلانے! تو نے حضورؐ سے حج کی قبولیت کا سرٹیفکیٹ بھی لے لیا ہے یا نہیں؟ اس نے پوچھا - کیا تم سب نے لے لیا ہے؟ کہا: ہاں - بولا: میں ابھی آتا ہوں - یہ کہہ کر بھاگ کر مسجدِ نبوی پہنچا اور جالیوں میں ہاتھ ڈال کر کہا کہ یا رسول اللہ آپ نے مجھے تو سرٹیفکیٹ دیا ہی نہیں اور پھر بھاگا بھاگا گاڑی پر پہنچا اور بتایا کہ میں سرٹیفکیٹ لے آیا ہوں - لوگوں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں ایک بہت پرانے طرز کا کاغذ تھا اس پر لکھا تھا کہ تمہارا حج قبول ہو گیا اور نیچے "محمد رسول اللہ" کی مہر تھی - لوگ اس کا منہ دیکھتے رہ گئے -

----

○ ... محمد سعید دباس، سوری، ریاض میں کمپیوٹر کی ایک فرم میں ملازم ہیں۔ انہوں نے اپنی والدہ کا قصہ ڈاکٹر زبیر احمد صاحب کو سنایا اور ڈاکٹر زبیر احمد صاحب نے مکہ مکرمہ میں مجھے سنایا۔ اگر یہ دونوں حضرات انتہائی ثقہ اور متدین نہ ہوتے تو میں یہ قصہ درج نہ کرتا۔

قصہ یہ ہے کہ دباس صاحب کی والدہ کو پیٹ کا السر ہوا اور منہ سے خون آنا شروع ہو گیا اور مرض اس مرحلہ پر پہنچ گیا کہ دو تین ہسپتالوں میں لے گئے تو انہوں نے داخل کرنے سے انکار کر دیا۔ بالآخر ایک عیسائی ڈاکٹر کے پاس گئے۔ اس نے بڑے تردد کے بعد کہا کہ اچھا میں کوشش کرتا ہوں، چنانچہ آپریشن کا وقت متعین ہو گیا۔ آپریشن سے قبل ان کی والدہ پر غنودگی کی کیفیت طاری ہوئی اور اسی حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا۔ آپؐ نے سینے اور پیٹ پر دستِ مبارک پھیرا۔ اس کے بعد ایکسرے لے لیا تو السر کا نام و نشان نہ تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر نے کچھ گولیاں دے کر رخصت کر دیا۔

○ ... ٨/٧/١٤٠٧ھ مطابق ٨/٣/١٩٨٧ء

آج حرم مکی میں میرے مرکز البحث العلمی کے رفیق کار ڈاکٹر نجاتی نے ایک ترک جوان محمد یار یانق سے ملاقات کرائی، جو تبلیغی جماعت سے وابستہ ہیں اور رائے ونڈ میں رہنے اور وہاں باقاعدہ اردو سیکھنے پڑھنے سے کسی حد تک اردو میں بھی گفتگو کرتے ہیں۔ ڈاکٹر نجاتی نے ان کا ایک خاص واقعہ ہمیں کئی ماہ پہلے سنایا تھا اور اسی واقعہ کی بنا پر ہم نے ان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ محمد یار یانق نے غار حراء میں چلہ کرنے کی نذر مانی اور ضرورت کا سامان لے کر وہاں چلے گئے، لیکن چند روز بعد بیمار ہوئے اور بیماری نے شدت اختیار کر لی۔ مکہ کے ایک صاحبِ ثروت شخص سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب

میں فرمایا کہ ہمارا فلاں شخص غار حراء میں بیمار ہے، اسے جا کر لے آؤ۔ وہ وہاں پہنچا، اپنے ساتھ لایا، اپنے پاس رکھا، انہیں رہنے کے لئے ایک بنگلہ دیا اور سواری کے لئے ایک مرسیڈیز۔ آج کل وہ ترک اسی کے پاس ہیں۔

○ .... عبید الرحمن صاحب فیصل آباد (پاکستان) کے رہنے والے ہیں۔ یہ بچپن ہی میں اپنے والدین کے ساتھ مکہ معظمہ میں آبسے تھے۔ ان کی تعلیم بھی یہیں ہوئی اور مدتوں جامعہ ام القریٰ کی لائبریری میں ملازم رہے۔

موصوف نے بیان کیا کہ ہم لوگ رباط ٹونک میں رہتے تھے۔ اوپر والدین تھے اور نیچے کے کمرے میں میرا قیام تھا۔ جس کمرے میں میری رہائش تھی اس میں ایک سانپ تھا۔ میرے والد نے مجھ سے کہہ رکھا تھا کہ یہ سانپ تمہیں نہیں ستائے گا، تم بھی اسے مت ستانا۔ چنانچہ کبھی کبھی اپنے سامنے ادھر سے ادھر جاتے دیکھ لیتا تھا، کسی صبح سو کر اٹھتا تو دیکھتا وہ میرے پہلو میں سویا ہوا ہے۔ کبھی ایسا ہوتا کہ میں باہر جانے کے لئے تیار ہو کر کھونٹی سے کرتا اتارتا تو وہ آستین میں سے ٹپک پڑتا۔ مدتوں میں اسی حال میں اس کمرے میں رہا۔

مکہ معظمہ میں ٹونک (ہندوستان کی ایک سابق ریاست) کی دو رباطیں تھیں، ایک شامیہ میں جبل ہندی کی جانب، دوسری حارۃ الباب میں۔ عبید صاحب کا واقعہ حارۃ الباب والی رباط کا ہے۔ میں نے یہ دونوں رباطیں دیکھی ہیں لیکن بوسیدہ ہو جانے کی وجہ سے اب دونوں منہدم کی جا چکی ہیں۔ پہلے شامیہ والی منہدم کی گئی اس کے دو تین سال بعد حارۃ الباب والی۔

اردو ادب کی ایک لاجواب پیش کش
حیاتِ بقا
محمد مظہر بقا
فاضل دیوبند ایم اے، پی ایچ ڈی
بقا پرنٹرز اینڈ پبلشرز
کراچی
خود نوشت میں ایک بیش قیمت اضافہ
ایک عالم، پروفیسر، مصنف اور محقق کی دل چسپ داستانِ حیات
یہ ایک شخص کی خود نوشت ہی نہیں، ایک خانوادہ، علم و تہذیب کا تذکرہ بھی ہے
مصنف کی بامحاورہ زبان اور دل کش اسلوبِ تحریر کے علاوہ صاف گوئی اور حقیقت بیانی نے اسے
دل چسپ تر بنادیا ہے۔
مسلمانوں کے ایک عہد کی تہذیبی تاریخ اور سماجی زندگی کا آئینہ
۲۳ x ۳۶ / ۱۶ سائز کے ۶۳۸ صفحات، نفیس آفسٹ پیپر، کمپیوٹر کی نستعلیق کتابت اور اعلیٰ طباعت، مضبوط و
پائیدار جلد اور رنگین و دیدہ زیب گرد و پیش سے آراستہ۔
قیمت: ۱۵۰/- روپے

بقا پرنٹرز اینڈ پبلشرز کی آئندہ پیشکش

گیارھویں صدی عیسوی کا نامور عالم و فلسفی اور عربی زبان کا ادیب و شاعر

ابو العلاء المعری

اور اس کا فلسفہ

(۳۶۳ھ ۴۴۹ھ) (۹۷۳ء ۱۰۵۷ء)

عربی تاریخِ ادب و شعر کی ایک مایہ ناز، نادرِ روزگار اور زندہ جاوید شخصیت

تصنیف

ڈاکٹر محمد مظہر بقا

فاضل دیوبند، ایم۔اے، پی ایچ۔ڈی

اردو میں المعریٰ کا پہلا ادبی تذکرہ اور اس کے فلسفہ، شعر و حکمت پر اردو میں واحد تصنیف اور افکار کا مرقع

ابو العلاء المعریٰ --- بینائی سے محروم لیکن ذہانت میں فرد، فطانت و بداعت میں ایک بے مثال اور نہایت قوی الحافظہ شخصیت

مصنف کے وسیع مطالعے، اعلیٰ پایہ، تحقیق اور حسنِ تالیف اور کمال تدوین کا بہترین مرقع

دہلی کی ٹکسالی، بامحاورہ اور سلیس زبان اور شگفتہ اسلوبِ نگارش

اردو میں ہمیشہ زندہ رہنے والی تصنیف

بقا پرنٹرز اینڈ پبلشرز
کراچی

محمد مظہر بقا

فاضل دیوبند، ایم۔اے، پی ایچ۔ڈی، استاد جامعہ ام القریٰ، مکہ مکرمہ

تحقیقی مقالہ جس پر جامعہ کراچی نے انھیں پی ایچ۔ڈی کی ڈگری عطا کی

عہد علم و انقلاب کے فاتح کی داستان حیات

اور

علمی و عملی کارناموں کا بے مثال تذکرہ

شاہ صاحب کے حالات، خاندان، اساتذہ، شیوخ، اسفار، فقہ و تصوف میں ان کا ذوق و رجحان، فقہی نظریہ، مجتہدانہ مقام، سیاسی حالات کی اصلاح کے مساعی، درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں ان کی خدمات، ان کے عہد کے سیاسی، معاشرتی، اخلاقی حالات کی واقعی تفصیل اور اصحاب استعداد کی تعلیم و تربیت میں شاہ صاحب کی عظیم الشان خدمات کا تحقیقی تذکرہ۔ ولی اللہی لٹریچر میں ایک بے مثال اضافہ۔

۲۳x۳۶ / ۱۶ سائز کے ۶۳۲ صفحات، نفیس آفسٹ پیپر، معیاری کتابت اور اعلیٰ طباعت، مضبوط و پائیدار جلد اور خوبصورت گرد و پیش سے آراستہ

قیمت:-/۱۵۰ روپے

بقا پرنٹرز اینڈ پبلشرز

کراچی